باب دوم

مرزا سلامت علی دبیر

۱۲۸۲ھ/ ۱۸۶۵ء میں صفیر بلگرامی آرہ (بہار) سے مارہرہ اور وہاں سے اپنے منجھلے ماموں حضرت شاہ عالم مارہروی کے ساتھ دلی آئے اور مرزا غالب کے شاگرد ہوئے۔ صفیر نے ''جلوۂ خضر'' میں لکھا ہے کہ ''ایک دن مرثیے کا ذکر آ گیا۔ فرمانے لگے کہ ''میں نے بھی ایک مرثیہ شروع کیا تھا۔ تین بند کہہ کر دیکھا تو ''واسوخت'' ہو گیا...... پھر فرمایا واقعی یہ حق مرزا دبیر کا ہے۔ دوسرا اس راہ میں قدم نہیں اُٹھا سکتا'' [۱] اس زمانے میں میر انیس بھی لکھنؤ میں موجود تھے اور مرثیہ گو کی حیثیت سے ان کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ سوال یہ ہے کہ مرزا غالب نے مرزا دبیر ہی کا ذکر کیوں کیا جب کہ ایک خط بنام غلام غوث خاں بے خبر میں سہل ممتنع پر بحث کرتے ہوئے غالب نے انیس کے شعر پر صحیح اعتراض بھی کیا تھا [۲]۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ اس دور میں ناسخ کے ''طرزِ جدید'' کا طوطی بول رہا تھا جس کی پیروی چھوٹے بڑے سب شاعر کر رہے تھے۔ اس کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ ۱۲۴۰ھ میں جب دبیر کے استاد میر ضمیر کے استاد مصحفی نے اپنا دیوان ششم مرتب کیا تو دیباچہ میں لکھا کہ یہ دیوان میں نے ناسخ کے رنگ میں کہا ہے۔ اسی طرح غالب اور مومن نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں رنگِ ناسخ (طرزِ جدید) میں شعر کہنے کی مشق کی [۳]۔ رنگِ ناسخ اس دور کے طبقۂ خواص کی تہذیب کا پسندیدہ و محبوب رنگِ شاعری تھا جس میں خیال بندی، مضمون آفرینی، مثالیہ اور توجیہ تمثیلیہ سے نئی نئی مناسبات تلاش کر کے دور کے مضمون کو استدلال کے ساتھ ربط دیا جاتا تھا۔ مرزا دبیر کا رجحان بھی ناسخ کے اسی رنگِ سخن کی طرف تھا۔ وہ بھی طبقۂ خواص میں اسی لیے اپنے دور میں اپنے ہم عصر میر انیس سے زیادہ بڑے مرثیہ گو سمجھے جاتے تھے اور اسی لیے مرزا دبیر غازی الدین حیدر سے لے کر واجد علی شاہ کے دورِ حکومت تک دربار سے وابستہ رہے۔ ملکہ زمانی زوجہ شاہ نصیر الدین حیدر، ان کی بیٹی سلطان عالیہ زوجہ نواب ممتاز الدولہ، حاجی بیگم دختر محمد علی شاہ کے ساتھ ہی نواب اقتدار الدولہ مستقیم الملک فرزند نواب سعادت علی خاں، نواب ممتاز الدولہ اور نواب والا قدر عرف نواب وزیر وغیرہ ان کے شاگرد تھے۔ خود ناسخ بھی مرزا دبیر کا نیا مرثیہ سننے کے لیے اپنے ایک شاگرد حسین علی خاں اثر کے گھر جاتے تھے اور اشعار سن کر نئے مضمون پر آوازِ بلند داد دیتے تھے [۴]۔ اس رنگِ ناسخ میں اس دور کی لکھنوی تہذیب کی روح بول رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب علی بیگ سرور کی تصنیف ''فسانۂ عجائب'' اردو نثر کا مثالی نمونہ سمجھی جاتی تھی۔ مرزا دبیر کے مرثیوں کے رنگِ سخن کو اس تہذیبی پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔ جب اس تہذیب کا رنگ پھیکا پڑ گیا تو ناسخ کی شاعری

Scanned with CamScanner

بھی بے مزہ اور کسیلی ہوگئی۔ اسی کے ساتھ مرزا دبیر کا مرثیہ بھی میر انیس کے مقابلہ میں ایک درجہ نیچے آ گیا۔ آتش کا وہ کلام جو رنگِ ناسخ میں کہا گیا تھا ان کے دیوان پر بوجھ بن گیا اور آتش اپنے ''نامقبول'' رنگِ شاعری سے پہچانے جانے لگے۔ عملِ تبدیلی کے زیر اثر تہذیب اُس کی روایات، اس کی قدریں، معیارِ پسند و ناپسندیوں ہی بدلتے ہیں اور ''ادب'' بھی زندگی کی طرح نئے روپ میں ڈھلنے لگتا ہے اور نئی زندگی کا آئینہ بن جاتا ہے۔

مرزا سلامت علی دبیرؔ (۱۲۱۸ھ [۵] -۱۲۹۲ھ [۶] ۱۸۰۳ء-۱۸۷۵ء) دلّی کے محلّہ بلّی ماران میں ۱۱ر جمادی الاول ۱۲۱۸ھ/ ۲۹ر اگست ۱۸۰۳ء کو پیدا ہوئے [۷]۔ کم عمری میں اپنے والد مرزا غلام حسین کے ساتھ لکھنؤ آ گئے۔ یہیں لکھنؤ میں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ مرزا سلامت علی دبیرؔ نے علوم متداولہ حاصل کر کے صرف و نحو اور منطق و ادب کے ساتھ حکمت بھی مولوی غلام ضامن سے پڑھی۔ کتب دینیہ، حدیث، فقہ و تفسیر و اصول تفسیر کا علم مرزا محمد رضا برق کے والد مرزا کاظم علی سے حاصل کیا۔ مطالعہ کے شوق نے علم کو وسعت دی۔ اسی وجہ سے وہ اپنے زمانے میں ایک عالم کی حیثیت سے بھی عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ عبادت گزار انسان تھے۔ ابھی نوعمر ہی تھے کہ شعر و شاعری کی طرف مائل ہوئے اور غزلیں کہنے لگے۔ غزل اس دور کی مقبول ترین صنفِ سخن تھی۔ دبیر کی چند غزلیں آج بھی دستیاب ہیں [۸]۔ لیکن وہ تبرکِ دبیر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس زمانے میں دبیر گاہ گاہ مرثیہ خوانی بھی کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ طبیعت مرثیہ گوئی کی طرف مائل ہونے لگی۔ دبیرؔ نے باقی اصنافِ شاعری کو خیر باد کہہ کر پوری توجہ مرثیہ گوئی کی طرف مبذول کر دی۔ گیارہ سال کی عمر ہی میں وہ میر ضمیر کے شاگرد ہو گئے تھے۔ ''شمس الضحیٰ'' میں بھی یہی لکھا ہے کہ اس کے بعد انھوں نے ''غزلیات و ہزلیات و لغویات بلکہ قصائد مدح ملوک و سلاطین و حکام و وصف امراءِ ذوی الاحتشام دست کشید و از سن یازدہ سالگی سالکِ مسالکِ رضائے ایزدی و انشاءِ اشعار در مناقب و مصائب مقبولانِ بارگاہ سرمدی گردید'' [۹]۔

دبیر نے جب مرثیہ گوئی شروع کی تو اس وقت غازی الدین حیدر کی بادشاہی تھی۔ بادشاہِ وقت نے بھی انھیں مرثیہ خوانی کے لیے بلایا تھا اور یہ اس زمانے میں بہت بڑی بات تھی۔ دبیر کی مرثیہ گوئی کا یہ سلسلہ ان کی وفات ۱۸۷۵ء تک مسلسل جاری رہا۔ وہ پیدائشی شاعر تھے اور اپنی قادر الکلامی، علم اور شاعرانہ صلاحیتوں کے باعث ان کی شہرت ہر طرف بڑھتی پھیلتی جا رہی تھی۔ انھوں نے اپنے استاد میر ضمیر کے مراثی کی ترتیب کو قبول کر کے اس میں توازن پیدا کیا اور اپنے مرثیے کو اس رنگِ شاعری (طرزِ جدید) کے روپ میں ڈھالا جو اس وقت کے لکھنؤ کا مقبول عام رنگ تھا اور جس کے سب سے ممتاز نمائندے شیخ امام بخش ناسخ تھے۔ یہ وہ رنگِ سخن تھا جس میں قوتِ متخیلہ سے نئی نئی مناسبات تلاش کر کے، دور کے مضمون کو شاعرانہ استدلال کے ساتھ، ربط دیا جاتا تھا۔ اس ''طرز جدید'' میں شعر پر غور کرنے سے ہی اس کے معنی واضح ہوتے تھے۔ جب

Scanned with CamScanner

تاریخ کا طرز جدید، میر ضمیر کی ترتیب مرثیہ کے ساتھ، مرزا دبیر کے ہاں نمایاں ہوا تو ''نیا مرثیہ'' وجود میں آیا جس کی ترجمانی و نمائندگی مرزا دبیر نے کی۔ یہ مرثیہ اس دور کے لکھنؤ کا پسندیدہ مرثیہ تھا۔ شاد عظیم آبادی نے لکھا ہے کہ ''تشبیہ و استعارات، تراکیب و نازک خیالی میں ایک معنی پوشیدہ کار کھ دینا انہی کا کام تھا''۔ مرزا دبیر غازی الدین حیدر سے لے کر واجد علی شاہ تک سب درباروں سے وابستہ رہے۔ ''شمس الضحیٰ'' میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ جب وہ اعلیٰ حضرت واجد علی شاہ کے حضور میں مرثیہ پڑھ رہے تھے کہ ناگاہ شامیانہ پراگندہ ہو گیا اور دھوپ حضرت دبیر کے چہرے پر پڑنے لگی۔ بادشاہ وقت اسی وقت اپنی جگہ سے اُٹھے اور چھتری لے کر منبر کے قریب اس وقت تک سایہ کیے رہے جب تک مرثیہ پورا نہ ہو گیا[۱۰]۔

سعادت خاں ناصر نے لکھا ہے کہ ''عطارد نظیر مرزا سلامت علی تخلص دبیر جودت اس کی طبع کی تقریر سے باہر اور تحریر سے زیادہ طبیعت اس کی مضمون کے پیدا کرنے پر آمادہ، مرثیہ گوئی میں گوئے سبقت ہمگناں سے لے گیا ہے اور زمینِ سلام کو اس کی فکر بلند نے آسمان کیا ہے۔ ہر مرثیہ لاجواب، ہر بند اس کا انتخاب۔ جو شہرت اس نے پیدا کی ہے، بیان اس کا نکلنے دشوار ہے''[۱۱] اسی رنگ سخن، جسے میں نے ''نیا مرثیہ'' کہا ہے، کی وجہ سے مرزا دبیر اس دور میں میر انیس سے زیادہ مقبول و مشہور تھے۔ ''شمس الضحیٰ'' میں یہ بھی لکھا ہے کہ آنکھیں بنوانے کے لیے جب مرزا دبیر کلکتہ گئے تو وہاں کی ایک مجلس میں واجد علی شاہ نے بیس پچیس بند مرزا دبیر کی مدح میں پڑھے جس کا ایک شعر یہ ہے:

بچپن سے ان کے دامِ سخن میں اسیر ہوں		میں کم سنی سے عاشق نظم دبیر ہوں

مرزا دبیر کے حالات میں بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ مرزا دبیر نے اپنے استاد میر ضمیر سے کیے ہوئے عہد کو توڑا[۱۲]۔ ''تنقید آب حیات'' میں اس کی تفصیل درج ہے[۱۳] اور ''خمخانۂ جاوید'' میں بھی اس کی تفصیل موجود ہے[۱۴] دراصل یہ سازش میر ضمیر کے ایک شاگرد میر عابد علی بشیر نے افتخار الدولہ کے ہاں کی اور ایسی صورت پیدا کر دی کہ استاد کے دل میں گرہ پڑ گئی۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد جب مرزا دبیر نواب حضور عالم علی نقی خان بہادر کی مجلس عزا میں نیا مرثیہ پڑھ رہے تھے اور میر ضمیر بھی وہاں موجود تھے تو سخن شناسوں کی تحسین پر مرزا دبیر نے میر ضمیر کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ سب تصدق جناب استاد کا ہے۔ جب مرثیہ پڑھ کر مرزا دبیر منبر سے نیچے اترے تو میر ضمیر نے اُٹھ کر اپنے لائق شاگرد کو گلے سے لگا لیا اور اپنے گھر لے گئے اور ساری بات کھل کر سامنے آ گئی۔ میر ضمیر کو دبیر پر فخر تھا جس کا اظہار ایک رباعی میں کیا ہے:

پہلے تو یہ شہرہ تھا ضمیر آیا ہے		اب کہتے ہیں استاد دبیر آیا ہے
کر دی مری پیری نے مگر قدر سوا		اب قول یہی ہے سب کا پیر آیا ہے

عہد امجد علی شاہ میں جب میر انیس لکھنؤ آئے اور مجلسوں میں مرثیے پڑھنے شروع کیے تو اس وقت مرزا دبیر دور دور تک مشہور ہو چکے تھے لیکن جلد ہی انیس کی شہرت بھی تیزی سے پھیلنے لگی اور ان کی مقبولیت کے

ساتھ لکھنؤ میں دو گروہ پیدا ہو گئے۔ ایک گروہ دبیر کا اور دوسرا گروہ انیس کا حامی و مداح تھا۔ دبیر کو پسند کرنے والا گروہ "دبیریے" کہلایا اور انیس کو پسند کرنے والا گروہ "انیسے" کہلایا۔ دونوں استادوں نے گاہ گاہ ایک ہی موضوع پر مرثیے لکھے اور اپنی قدرتی تخلیقی صلاحیتوں سے اردو مرثیے کو نیا رنگ و آہنگ دیا۔ اشاروں اشاروں میں اپنی رباعیوں اور سلاموں میں ایک دوسرے پر چوٹیں بھی کیں لیکن درمیان سے پردا نہیں اٹھایا۔ اگر ایک نے کوئی مضمون کم چستی سے باندھا تو دوسرے نے اسے بہتر طور پر باندھ کر دکھایا لیکن دونوں خود ایک دوسرے کے کمال کی کھلے بندوں تعریف کرتے رہے۔ جب میر انیس کا انتقال ہوا تو دبیر نے جو قطعہ تاریخ وفات کہا اس میں کھل کر ایسی تحسین کی ہے جس سے ان دونوں کے درمیان کسی معاصرانہ چشمک کا دور دور تک پتا نہیں چلتا۔ انیس کے مرنے کے بعد دبیر کہا کرتے تھے کہ اب شعر کہنے اور پڑھنے کا لطف نہیں رہا۔ تین ماہ بعد دبیر کی زندگی کا چراغ بھی گل ہو گیا اور اردو مرثیہ ایک جگہ پر ٹھہر گیا۔ یہ مسکی مرثیے کا نقطۂ عروج تھا جس سے آج تک کوئی دوسرا دبیر یا دوسرا انیس پیدا نہ ہو سکا۔ ان دونوں کو خاتمین مرثیہ کہنا چاہیے۔ انیسوں اور دبیریوں کا یہ گروہ ہر اس شہر میں موجود تھا جہاں ان دونوں مرثیہ گویوں کے مرثیے پہنچے یا پڑھے گئے تھے۔ جب شبلی نعمانی نے "موازنہ انیس و دبیر" لکھا اور انیس پر، اپنے دور کے مذاقِ سخن کے مطابق مہرِ تحسین ثبت کی اور دبیر کے کلام پر ناپسندیدگی کی مہر لگائی تو ان دونوں گروہوں کے لیے شبلی نعمانی بھی انیسے کہلائے اور جواب میں دبیریوں نے "المیزان" لکھی۔ "آبِ حیات" میں انیس و دبیر کے کلام پر تبصرے کے پیشِ نظر محمد حسین آزاد بھی انیسے سمجھے گئے اور ان کی تردید میں میر محمد رضا ظہیر نے "تنقیدِ آبِ حیات" لکھی۔ ثابت لکھنوی کی "حیاتِ دبیر" بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ میر مہدی حسن احسن لکھنوی نے "حیاتِ انیس" اور میر امجد علی اشہری "واقعاتِ انیس" لکھ کر انیسے کہلائے جس کے جواب میں دبیریوں نے "شمس الضحیٰ" از مولوی صفدر حسین، "ردالموازنہ" از افضل علی فضو، "تردیدِ موازنہ" از شیخ محمد جان عروج فیض آبادی، "ردواقعاتِ انیس" از سردار مرزا اور "حیاتِ دبیر" از سید افضل حسین ثابت لکھنوی وغیرہ نے کتابیں لکھیں۔ ادیب نے لکھا ہے کہ اگر غور سے دیکھا جائے تو انیس و دبیر دونوں کے رنگ ایک دوسرے سے الگ اور منفرد تھے مثلاً یہ کلام دیکھیے جس میں ایک ہی مضمون یا موضوع پر انیس و دبیر دونوں نے طبع آزمائی کی ہے[۱۵]: دبیر نے ایک رباعی میں کہا:

گھر اپنا اجاڑ کر بسایا تجھ کو ڈھانپا جو کفن سے منھ دکھایا تجھ کو
اے قبر کہاں کہاں نہ کی تیری تلاش جب خاک میں مل گئے تو پایا تجھ کو

انیس نے کہا:

مر مر کے مسافر نے بسایا ہے تجھے رخ سب سے پھرا کے منھ دکھایا ہے تجھے
کیوں کر نہ لپٹ کے تجھ سے سووں اے قبر میں نے بھی تو جان دے کے پایا ہے تجھے

دبیر نے ایک رباعی کہی:

Scanned with CamScanner

آج آئے کل کوچ کی تیاری ہے — غفلت میں کٹی عمر یہ ہشیاری ہے
دنیا ہے عجب مقام حیرت نہ کھلا — یہ عالم خواب ہے کہ بیداری ہے

انیس نے کہا:

جس شخص کو عقبیٰ کی طلب گاری ہے — دنیا سے ہمیشہ اسے بے زاری ہے
اک چشم میں کس طرح سمائیں دونوں — غافل وہ خواب ہے یہ بیداری ہے

دبیر نے کہا:

شیریں سخنی کے فن سے شہ زور ہوں میں — پر بخت یہ کہتا ہے ارے شور ہوں میں
اس بند میں طوطیِ قفس کے مانند — خوبی سے زباں کی زندہ درگور ہوں میں

انیس نے کہا:

کس جسم پہ بل کروں کہ شہ زور ہوں میں — دیکھو کہ ضعیف صورتِ مور ہوں میں
تن پر یہ پڑی ہے گرد بازار کساد — ثابت ہوتا ہے زندہ درگور ہوں میں

دبیر نے کہا:

کس عہد میں تبدیل نہیں دَور ہوا — گہ عدل گہے ظلم گہے جور ہوا
اللہ وہی ہے تو نہ مضطر ہو دبیرؔ — کیا غم جو زمیں اور فلک اور ہوا

انیس نے کہا:

افسوس زمانے کا عجب طور ہوا — کیوں چرخِ کہن نیا یہ کیا دَور ہوا
گردش کب تک نکل چلو جلد انیس — اب یاں کی زباں اور فلک اور ہوا

اس وقت یہ چشمک کھل کر سامنے آ گئی جب انیس نے وہ مشہور سلام لکھا جس کا ایک شعر یہ ہے:

یہ جھریاں نہیں ہاتھوں پہ ضعفِ پیری نے — چنا ہے جامۂ اصلی کی آستینوں کو

واجد علی شاہ نے بھی اس زمین میں سلام کہا جس کا حوالہ ہم انیس کے مطالعے میں دے آئے ہیں۔ ادھر دبیرؔ کے فرزند اوجؔ نے بھی اسی زمین میں سلام کہا۔ مونس نے بھی اسی زمین میں سلام اور یہ شعر بھی کہا جس میں دوسرے فریق پر چوٹ واضح تھی:

بھلا تردِ بے جا سے ان میں کیا حاصل — اٹھا چکے ہیں زمیں دار جن زمینوں کو

مرزا دبیر نے کہا:

قبول شرع میں دعویٰ بے دلیل نہیں — دکھائیں گھر کے قبالے میں ان زمینوں کو

یہ سوال جواب ابھی تک سنجیدگی سے ہو رہے تھے کہ ہر سیہ گو گوہر علی مشیر بھی اس چشمک میں شامل ہو گئے اور اپنے ہر سیے میں یہ شعر لکھا:

Scanned with CamScanner

ہزار بار سزا پا کے منھ پہ چڑھتے ہیں مشیر کیا کہوں ان احمق الذینوں کو

جب معاملہ اس سطح پر اتر آیا تو انیس اور دبیر نے اپنے اپنے شاگردوں کو ایک دوسرے کے ہاں بھیجا اور قصور معاف کرایا۔

بعض اشعار میں دونوں نے ایک دوسرے پر سرقے کا الزام لگایا ہے۔ انیسؔ نے کہا:

بہتا ہے انیس خونِ انصاف مضموں مرے قتل ہو رہے ہیں

دبیر نے کہا:

سرقہ مضموں کا زبوں ہوتا ہے یعنی علَم نظم نگوں ہوتا ہے
پر ان میں جو مندرج ہے حالِ شہدا اس سے مرے مرثیے کا خوں ہوتا ہے

انیس نے کہا:

کب دُزد سے دولتِ ہنر بچتی ہے لے بھاگتے ہیں جب کہ نظر بچتی ہے
ممکن نہیں دزدانِ مضامیں سے نجات سچ ہے کہ مگس سے کب شکر بچتی ہے

دبیر نے کہا:

شکر خدا کہ سرقہ کی حد سے بعید ہوں ہر مرثیہ میں موجدِ طرز جدید ہوں
ہے استفادہ مجھ کو احادیث و سیر سے یعنی بری ہوں سرقۂ مضمونِ غیر سے

یہ وہ زمانہ تھا کہ سارا معاشرہ شعر و شاعری میں گہری دلچسپی لیتا تھا اور معاشرہ و شاعری ایک ہو گئے تھے۔ ادیب نے لکھا ہے کہ ''لکھنؤ کی عام ادبی سطح اتنی بلند کبھی نہ تھی جتنی انیس و دبیر کے عہد میں ہوئی'' [۱۶]۔ مجلس کے مذہبی رنگ اور عزاداری میں مرثیے کے عام رواج نے شاعری کو اس تہذیب کا جزو اول بنا دیا تھا۔

مرزا دبیر ساری عمر مرثیہ گوئی اور سلام و رباعی وغیرہ کہنے میں دن رات لگے رہے اور ایک بڑا ذخیرہ یادگار چھوڑا۔ ان کے مرثیوں کا ایک مجموعہ، جو دو جلدوں پر مشتمل تھا، مطبع اودھ اخبار سے ''مجموعہ ہائے مرثیہ مرزا دبیر'' کے نام سے جلد اول ۱۸۷۵ء میں اور جلد دوم ۱۸۷۶ء میں شائع ہوئی۔ اس مجموعے میں نہ صرف الحاقی مراثی شامل ہو گئے ہیں بلکہ املا و ترتیب کی بھی متعدد غلطیاں ہیں۔ اس کے بعد بیس جلدوں پر مشتمل مرزا دبیر کے مراثی ''دفتر ماتم'' کے نام سے مختلف مطبعوں سے شائع ہوئے۔ ان بیس جلدوں میں بھی ان کا سارا کلام شامل نہیں ہے۔ ''دفتر ماتم'' کی بیس جلدوں میں سے پہلی چودہ جلدیں مرثیوں پر مشتمل ہیں جن کی تعداد ۳۶۶ ہے۔ اکبر حیدری نے لکھا ہے کہ ''بعض مرثیوں میں تکرار ہے اس لیے صحیح تعداد ۳۶۰ ہے۔ ڈاکٹر مرزا زماں آزردہ نے بتایا ہے کہ ''چار مراثی دفترِ ماتم'' میں ایسے ہیں جو میر ضمیر مرحوم کے نام سے مجموعہ مرثیہ میر ضمیر میں شامل ہیں'' [۱۷]۔ جلد پندرہ دو مذہبی مثنویوں پر مشتمل ہے۔ ایک مثنوی کا نام ''احسن القصص'' ہے جس میں چہاردہ معصومین کے حالات ولادت و فضائل و معجزات کو نظم کیا گیا ہے۔ آخر میں مثنوی کی ہیئت میں

Scanned with CamScanner

''معراج نامہ'' شامل ہیں [۱۸]۔ جلد سولہ، سترہ، اٹھارہ میں سلام جمع کیے گئے ہیں اور انھیں بصورت دیوان ردیف وار مرتب کیا ہے۔ ان میں سلاموں کی تعداد ۳۳۲ ہے [۱۹]۔ انیسویں جلد میں مخمس سلام ہیں اور بیسویں جلد میں ردیف وار رباعیاں، نوحے اور واقعات اور تضمینیں اور مناجات و قطعات وغیرہ متفرق کلام شامل ہے [۲۰]۔ ان کے علاوہ دو جلدوں پر مشتمل مرثیہ کے مرزا دبیر جلد اول کے نام سے دوسری بار ۱۹۰۵ء میں اور مرثیہ ہائے مرزا دبیر (جلد دوم)، بار ششم ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئے۔ ''سبع مثانی'' کے نام سے مرزا دبیر، شاگرد اوج نے ۱۹۳۰ء میں چودہ مرثیوں پر مشتمل ایک مجموعہ جس میں دو غیر مطبوعہ مرثیے بھی شامل ہیں، شائع کیا۔ مہذب لکھنوی نے ۱۹۵۱ء میں سات مرثیوں کا مجموعہ ''شعار دبیر'' کے نام سے شائع کیا۔ آخری دو مرثیے ''دفتر ماتم'' یا کسی اور مطبوعہ جلدوں یا مجموعوں میں شامل نہیں ہیں۔ ۱۹۸۰ء میں اکبر حیدری کاشمیری نے ''انتخاب مراثی دبیر'' کے نام سے ۲۱ مرثیے مع فرہنگ لکھنؤ سے شائع کیے۔ ۱۹۹۴ء میں ''باقیات دبیر'' کے نام سے اکبر حیدری نے ایک اور مجموعہ شائع کیا جس میں غیر مطبوعہ مراثی شامل ہیں جن کی تعداد ۲۶ ہے۔ پاکستان میں ''نادرات مرزا دبیر کے نام سے ڈاکٹر صفدر حسین نے پانچ غیر مطبوعہ مراثی دبیر شائع کیے لیکن اس میں بھی دو مرثیے مطبوعہ ہیں۔ ۱۹۸۰ء میں ''منتخب مراثی دبیر'' کے نام سے ڈاکٹر ظہیر فتح پوری نے بیس مرثیوں پر مشتمل ایک مجموعہ مجلس ترقی ادب لاہور سے شائع کیا اور پھر ''جواہر دبیر'' کے نام سے مرتضیٰ حسین فاضل نے چودہ مرثیوں پر مشتمل ایک مجموعہ غلام علی اینڈ سنز لاہور سے ۱۹۸۶ء میں شائع کیا اور ۱۹۹۵ء میں ۲۵ مراثی، ۳۹ رباعیات، ۸۰ سلام اور دو الوداعیوں پر مشتمل ایک مجموعہ ''دفتر دبیر'' کے نام سے ڈاکٹر ہلال نقوی نے کراچی سے شائع کیا۔ اکبر حیدری نے دبیؔر کے ۹۷ غیر مطبوعہ مراثی اور بھی دریافت کیے ہیں [۲۱]۔

''ابواب المصائب'' مرزا دبیر کی نثری تصنیف ہے جس کا سال تصنیف ۱۲۴۵ھ/۱۸۲۹ء ہے۔ آل رسول کی مدح اور ان کے مصائب کا بیان اس کتاب کا موضوع ہے۔ اس تصنیف کا مقصد وہی ہے جو مرثیے کا ہوتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ مرثیہ نظم میں ہوتا ہے اور ''ابواب المصائب'' نثر میں ہے۔ چھ ابواب پر مشتمل مرزا دبیر کی یہ تصنیف، جو ایک ہفتے میں ''روضۃ الشہدا'' کی روایت میں اس لیے لکھی گئی ہے تاکہ اسے مجلسوں میں پڑھ کر سنایا جا سکے۔ وجہ تالیف میں دبیر نے لکھا ہے کہ ''برادران مومنین و شیعیان ائمہ معصومین علیہم السلام پر واضح ہو کہ بنا تالیف اس کتاب ''ابواب المصائب'' کی مقرر کی گئی کیفیت نزول سورۂ یوسف علیہ السلام پر اور مطابقت مصائب یوسف آل عبا اعنی جناب سید الشہدا و علیہ التحیۃ والثنا و اہل بیت رسول خدا پر اور مصائب حسین ابن علی علیہ السلام'' [۲۲]۔ اس کا انداز تحریر اور رنگ بیان فضلی کی ''کربل کتھا'' سے مماثلت رکھتا ہے۔

''فسانۂ عجائب'' ۱۲۴۰ھ میں تصنیف ہوئی اور یہ اپنے رنگ نثر کے اعتبار سے منفرد کتاب ہے۔ مرزا دبیر نے نثر میں رجب علی بیگ سرور کی تصنیف کا اتباع نہیں کیا بلکہ اس مقصد کو سامنے رکھا کہ لوگ ''روضۃ الشہدا'' کی طرح مجلسوں میں اسے پڑھ کر سنائیں، اسی لیے اس کی نثر عام فہم ہے۔

Scanned with CamScanner

مرزا دبیر زود گو، مسلم الثبوت اور قادر الکلام شاعر تھے۔ ساتھ ہی وہ صاحبِ علم بھی تھے۔ احادیث و تفسیر پر ان کی اچھی نظر تھی۔ فارسی و عربی پر عبور رکھتے تھے۔ متقی و پرہیز گار تھے۔ وضع داری و شرافت اور سادگی و انکسار ان کے مزاج کا حصہ تھے۔ کھلا ہاتھ تھا۔ دل کھول کر ضرورت مندوں کی مدد کرتے تھے۔ ان کی فیاضی کے بہت سے واقعات مختلف کتابوں میں درج ہیں [۲۳]۔ لکھنوی تہذیب ان کے وجود کا حصہ تھی۔ مرثیہ گوئی ان کا مشغلہ بھی تھا اور ان کا پیشہ بھی۔ مزاجاً دبیر زاہدِ خشک نہیں تھے بلکہ دوستوں کی محفل میں ہنسی مذاق بھی کرتے تھے۔ ''خوش معرکۂ زیبا'' میں سید میر جان ذاکر کے ترجمے میں لکھا ہے کہ ایک دن مرزا دبیر نے ازراہِ مذاق سید محمد جان ذاکر سے کہا کہ میر صاحب! آپ اپنے تخلص ذاکر سے حرف ''الف'' دور کر دیجیے۔ میر صاحب نے جواب دیا بشرطے کہ حرف ''ی'' تمھارے یہاں سے دور ہو جائے [۲۴]۔

مرزا دبیر نے اس دور کے مقبول رنگِ ناسخ میں دادِ شاعری دی۔ وہ ہمہ وقت مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی میں مصروف رہتے تھے اور اسی لیے اپنے مرثیوں پر وہ اتنی توجہ نہیں دے پاتے تھے جتنی توجہ نوک پلک سنوارنے میں میر انیس اپنے مرثیوں پر دیتے تھے۔ لیکن اس ساری مصروفیت کے باوجود اپنے شاگردوں کے کلام پر اصلاح توجہ سے دیتے اور ساتھ ہی ان کی تعلیم بھی کرتے جاتے۔ ثابت لکھنوی نے ''حیاتِ دبیر'' میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ کسی شاگرد کا کہا ہوا مرثیہ ایک شاگرد کو صاف کرنے کے لیے دیا۔ اس نے نقل کرتے ہوئے درجِ ذیل شعر کے دوسرے مصرع میں لفظ ''اقبال'' کو بدل کر لفظ ''فتح'' کر دیا:

آپ آتے ہیں عورت نہ کوئی سامنے آئے اقبال سے کہہ دو کہ عناں تھامنے آئے

مرزا دبیر نے دیکھا تو کہا: ''اقبال'' اردو میں مذکر اور ''فتح'' مؤنث ہے۔ پس جب شاعر یہ کہتا ہے کہ عورت نہ کوئی سامنے آئے تو ''فتح'' کا، جو مؤنث ہے، سامنے آنا کب مناسب ہوگا۔ اس کے سوا ''اقبال'' کے لفظی معنی پر بھی غور کرو۔ اقبال کے معنی ''آگے'' کے ہیں، لفظ فتح میں یہ بات کہاں۔ پھر کہاں کہ اکثر ذاکر حضرات از بس کہ میرے مرثیوں میں الفاظ کی خوبی اور اثر کو نہیں سمجھتے اور اپنی سمجھ کے موافق مرثیوں کے الفاظ کو بدل دیتے ہیں۔

۱۸۵۶ء میں بادشاہ واجد علی شاہ معزول کر دیے گئے اور اودھ کی شاہی ہمیشہ کے لیے ختم و نابود ہوگئی۔ ۱۸۵۷ء کی قیامت خیز بغاوت میں مرزا دبیر سیتا پور چلے گئے اور جب امن قائم ہونے کے بعد لوٹے تو لکھنؤ اجڑ چکا تھا۔ مذہبی و تہذیبی سرگرمیاں ماند پڑ گئی تھیں۔ سرپرست منظر سے غائب ہو چکے تھے اور انگریز غالب آ چکے تھے جو اس تہذیب کے نہ قدردان تھے نہ اس میں دلچسپی رکھتے تھے۔ اب مرزا دبیر کی آمدنی کا ذریعہ وہ ایک سو تیس روپے ماہوار تھے جو امام باڑہ حسین آباد اور امام باڑہ میر باقر سے ملتے تھے۔ آمدنی بڑھانے کے لیے اب وہ عظیم آباد اور کان پور بھی مرثیہ خوانی کے لیے جانے لگے۔ اس دور میں باندی بیگم نے ان کی سرپرستی کی اور تاحیات یہ سلسلہ جاری رہا۔ ان کی صحت بھی اب پہلی جیسی نہیں رہی تھی۔ جسمانی صحت

Scanned with CamScanner

کے ساتھ ان کی بینائی بھی گرتی جا رہی تھی۔ ۲۹/ ذالحجہ ۱۲۹۱ھ/ ۱۸۷۴ء کو وہ آنکھ بنوانے کے لیے کلکتہ گئے۔ واجد علی شاہ (م ۱۸۸۷ء) نے ان کو برابر کا درجہ دیا اور وہیں جرمن ڈاکٹر سے ان کی آنکھ بنوائی اور وہ کامیاب لکھنؤ واپس آئے۔ کلکتہ جانے سے پہلے ان کا بیس سالہ بیٹا مرزا محمد ہادی حسین عطارد وفات پا گیا تھا۔ جب واپس آئے تو ان کے بڑے بھائی مرزا غلام محمد اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اسی سال میر انیس کا بھی انتقال ہو گیا۔ دبیر کی صحت بھی مسلسل گر رہی تھی۔ ورم جگر نے شدت اختیار کر لی تھی۔ اسی بیماری میں میر انیس کی وفات کے تین ماہ ایک دن بعد مرزا دبیر بھی اپنے معبودِ حقیقی سے جا ملے۔ مرنے کے بعد ان کی شہرت و مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ سارے لکھنؤ میں کہرام مچ گیا۔ ''اودھ اخبار'' میں مہینوں قطعات تاریخِ وفات اور ان کے حالات و خطوط شائع ہوتے رہے۔ ان کے شاگرد منیر شکوہ آبادی نے جو قطعات تاریخ کہے تھے ان میں سے ایک کے آخری شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی وفات ۳۰ محرم کو، فجر کے وقت، منگل کے دن ہوئی:

منیر سال و مہ و روز و وقت و تاریخش پگاہ و سلخ و سہ شنبہ مہِ عزا بودہ

دریا پر غسلِ دیا گیا اور ان کے اپنے مکان میں تدفین ہوئی۔ اگر آپ محلّہ نخاس لکھنؤ کے کوچۂ دبیر سے گزریں تو آج بھی ان کے مزار پر فاتحہ پڑھ سکتے ہیں۔

[۲]

مطالعۂ شاعری:

مرزا دبیر کے کلام کے مطالعے سے پہلے یہ دیکھتے چلیں کہ میر انیس اور مرزا دبیر کے تخلیقی مزاج میں کیا فرق ہے تاکہ ان دونوں کو ان کے اپنے رنگِ سخن کے آئینے میں دیکھا جا سکے۔ انیس و دبیر کے سلسلے میں یہ الجھاؤ اس وقت پیدا ہوا جب شبلی نعمانی نے ''موازنہ انیس و دبیر'' لکھ کر فوقیت کا تاج انیس کے سر پر رکھ دیا اور کہا: ''فصاحت ان کے کلام کو چھو بھی نہیں گئی، بندش میں تعقید اور اغلاق، تشبیہات اور استعارات، اکثر دور از کار، بلاغت نام کو نہیں، کسی چیز یا کسی کیفیت یا حالت کی تصویر کھینچنے سے وہ بالکل عاجز ہیں۔ خیال آفرینی اور مضمون بندی البتہ ہے لیکن اکثر جگہ اس کو سنبھال نہیں سکتے۔ ہماری یہ غرض نہیں کہ ان کے کلام میں سرے سے یہ باتیں پائی ہی نہیں جاتیں۔ وہ نہایت پرگو تھے۔ ان کے اشعار کا شمار ہزاروں کیا لاکھوں تک ہے۔ اخیر اخیر میں وہ میر انیس کی تقلید بھی کرنے لگے تھے۔ اس بنا پر ان کے کلام میں جا بجا شاعری کے لوازم اور خاصے پائے جاتے ہیں۔ لیکن گفتگو قلت اور کثرت میں ہے۔ میر انیس کے بہت سے اشعار میں فصاحت و بلاغت کا حصہ بہت کم ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ دونوں میں سے نسبتاً کس کا کلام شاعری کے معیار پر پورا اترتا ہے'' [۲۵]۔ اس مسئلے پر ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کی رائے ایک نئے زاویۂ نظر کو سامنے لاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انیس و دبیر دو

مختلف انفرادیتوں کے مالک ہیں اور دونوں کی حسیت اور نزاکت احساس (Sensibility) متضاد ہے۔ میر انیس کا ادراک قدرتی (نیچرل) ہے اور مرزا دبیر کا مابعد الطبیعیاتی (Metaphysical) ہے۔ مولانا حالی نے انگریزی رومانی تنقید کے رجحان کو اپنا کر نیچرل حسیت (Natural Sensibility) کو ترجیح دی مگر بیسویں صدی میں ٹی ایس ایلیٹ اور اس کے ہم خیالوں نے مابعد الطبیعیاتی ادراک کو جدید دور کی پیچیدگیاں ظاہر کرنے کے لیے زیادہ موزوں بتایا اور اس لیے اگر کوئی جدید ترین نظریے کا حامی انیس و دبیر کے کلام کو دیکھے تو وہ مرزا دبیر کو میر انیس پر ترجیح دے گا۔ یہ دونوں شاعر اس قدر منفرد ہیں کہ ایک کا دوسرے سے مقابلہ کرنا صحیح نہیں ہے۔ جدید دور میں تقابلی تنقید ایسے دو شاعروں کی انفرادیت کو تضاد سے واضح کرتی ہے۔ ڈاکٹر فاروقی کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں نقاد کا ذہن ابھی تک اس درجہ بے تعلقی و بے تعصبی (Disinterestedness) تک نہیں پہنچا ہے کہ تضاد سے انفرادیت کو دیکھ سکے۔ میر انیس اور مرزا دبیر رنگ فکر میں ایک دوسرے سے متضاد ہیں اور دونوں ہمارے ادب کی دو متضاد راہوں پر چل رہے ہیں۔ میر انیس، میر حسن اور اپنے خاندان کی روایت پر چل رہے ہیں۔ مرزا دبیر سودا اور خصوصاً ناسخ کی روایت پر چل رہے ہیں جو اس وقت کے لکھنؤ کا مقبول طرز تھا۔ یہ دونوں روایتیں ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ پھر مزاج کے اعتبار سے انیس و دبیر کا ادراک بھی متضاد ہے اور اس لیے ان دونوں کا موازنہ غلط ہے۔ اس دور میں مرزا دبیر ہی اس تہذیب اور اس سے مخصوص کی جانے والی صفات کے نمائندے ہیں اور اسی لیے وہ میر انیس سے زیادہ مقبول و محترم تھے اور میر انیس اپنے دور کے بجائے اس دور کے لیے اہم ہو جاتے ہیں جو سر سید کے زیر اثر حالی کی جدید تحریک ادب سے شروع ہوتا ہے۔ مرزا دبیر کی مرثیہ نگاری کا جائزہ لینے کے لیے ان کے مخصوص ادراک کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہیے۔

دبیر و انیس کے ادراک کا تضاد دیکھنا ہو تو ان کے مرثیوں کے ''چہروں'' کو دیکھیے۔ اس تضاد کو واضح کرنے کے لیے میں دونوں کے دو مشہور مراثی سے چند بند پیش کرتا ہوں۔ پہلے انیس کے مرثیے:

۵۔۔۔۔ ''پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زار صبح'' کے یہ چند بند پڑھیے:

پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زار صبح — گلزار شب خزاں ہوا، آئی بہار صبح
کرنے لگا فلک زر انجم نثار صبح — سرگرم ذکر حق ہوئے، طاعت گزار صبح
تھا چرخ اخضری پہ یہ رنگ آفتاب کا
کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا

چلنا وہ باد صبح کے جھونکوں کا دم بدم — مرغان صبح کی وہ خوش الحانیاں بہم
وہ آب و تاب نہر، وہ موجوں کا پیچ و خم — سردی ہوا میں، پر نہ زیادہ بہت، نہ کم
کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا

تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

وہ نور صبح اور وہ صحرا، وہ سبزہ زار — تھے طائروں کے غول درختوں پہ بے شمار
چلنا نسیمِ صبح کا رہ رہ کے بار بار — کو کو وہ قمریوں کی وہ طاؤس کی پکار

وا تھے دریچے باغِ بہشتِ نعیم کے
برسوں رواں تھے دشت میں جھونکے نسیم کے

آمد وہ آفتاب کی وہ صبح کا سماں — تھا جس کی ضو سے وجد میں طاؤسِ آسماں
ذروں کی روشنی پہ ستاروں کا تھا گماں — نہر فرات بیچ میں تھی مثل کہکشاں

ہر نخل پر ضیاے سر کوہِ طور تھی
گو یا فلک سے بارشِ بارانِ نور تھی

وہ پھولنا شفق کا وہ مینائے لاجورد — مخمل سی وہ گیاہ، وہ گل سبز و سرخ و زرد
رکھتی تھی پھونک کر قدم اپنا ہوائے سرد — یہ خوف تھا کہ دامنِ گل پر پڑے نہ گرد

دھوتا تھا دل کے داغ چمنِ لالہ زار کا
سردی جگر کو دیتا تھا سبزہ کچھار کا

انیس کے یہ بند پڑھ کر اب آپ مرزا دبیر کے ''چہرے'' کے یہ بند پڑھیے:

پیدا شعاعِ مہر کی مقراض جب ہوئی — پنہاں درازیِ پرِ طاؤسِ شب ہوئی
اور قطع زلف لیلیِ زہرہ لقب ہوئی — مجنوں صفت قباے سحر چاک سب ہوئی

فکرِ رفو تھی چرخِ ہنر مند کے لیے
دن چار ٹکڑے ہوگیا پیوند کے لیے

نکلا افق سے عابدِ روشن ضمیرِ صبح — محراب آسماں ہوئی جلوہ پذیرِ صبح
کھولا سپیدی نے جو مصلائے پیرِ صبح — پھر سجدہ گاہ بن گیا مہرِ منیرِ صبح

کرتی تھی شب عروب کا سجدہ ودود کو
سیارے ہفت عضو بنے تھے سجود کو

یوسف غریقِ چاہِ سیہ ناگہاں ہوا — یعنی غروبِ ماہ تجلی نشاں ہوا
یونس دہانِ ماہیِ شب سے عیاں ہوا — یعنی طلوعِ نیر مشرق ستاں ہوا

فرعونِ شب سے معرکہ آرا تھا آفتاب
دن تھا کلیم اور یدِ بیضا تھا آفتاب

روزِ سفید یوسفِ آفاق شب نقاب — مغرب کی چاہ میں تھا جو اُفتادہ زیرِ آب

سقائے آسماں نے لیا دَلوِ آفتاب اور ریسماں شعاع کی باندھی بہ آب و تاب
یوسف کو دَلوِ مہر میں بٹھلا کے چاہ سے
کھینچا دیارِ شرق میں مغرب کی راہ سے

سایہ جہاں جہاں تھا وہاں نور ہوگیا پھر مشکِ شب جہان سے کافور ہوگیا
گویا کہ زنگ آئنے سے دور ہوگیا باطل رسالۂ شبِ دیجور ہوگیا
کیا پختہ روشنائی تھی قدرت کے خامے میں
مضموں تھا آفتاب کا ذرّوں کے نامے میں

کھولے ہوا میں طائرِ زرّیں نے بال و پر بیٹھا وہ آکے چرخِ چہارم کے بام پر
دانے ستاروں کے جو پڑے تھے اِدھر اُدھر منقارِ زر میں چن لیے اس نے وہ سر بہ سر
پھر میہمانِ چشمۂ مہتاب ہوگیا
چشمہ تو خشک اور وہ سیراب ہوگیا

دبیر اور انیس کے یہ ''چہرے'' پڑھ کر، جن میں صبح کا منظر پیش کیا گیا ہے، دونوں کے مختلف ادراک کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ انیس کے چہرے میں مثنوی کا مزاج نمایاں ہے جس سے محمد تقی میر کا رنگ بھی جھلک رہا ہے۔ یہاں طرزِ فکر رومانوی ہے۔ انداز بیانیہ ہے جس میں نرمی ہے، راگ اور لے میں دھیما پن ہے اور لہجے میں نرمی و نسائیت ہے۔ انیس کا مصورانہ انداز اور اس سے پیدا ہونے والی محاکات منظر میں رنگ بھر رہی ہے۔ یہاں خیال آفرینی نہیں ہے تصویر کی متضاد صفات میں مناسبتیں تلاش کرنے کی کوئی کوشش نہیں ہے۔ استعارات و تراکیب بھی سادہ ہیں۔ یہاں مصوری کا عمل نمایاں ہے۔ اس کے برخلاف دبیر کے چہرے کی منظر نگاری میں قصیدہ کا رنگ جھلک رہا ہے۔ اس کا آہنگ بلند اور لہجے میں خطیبانہ مردانہ پن ہے۔ الفاظ میں شان و شکوہ ہے اور انیس کے مقابلے میں دبیر کے راگ کی رفتار بھی قدرے تیز ہے۔ یہاں دبیر کی علمیت بھی نمایاں ہے اور واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ذہن ''تخلیقِ معانی اور ایجادِ مضامین'' [۲۶] کی طرف مائل ہے۔ جہاں جہاں منظر کشی کی گئی ہے یہی صورت سامنے آتی ہے۔ دبیر کے ہاں مابعد الطبیعیاتی تصورات شعری پیکر (Imagery) کو جنم دیتے ہیں اور ان کا اظہار پُر شکوہ اسلوب میں ہوتا ہے۔ یہ وہ اسلوب ہے جو رزمیہ کے لیے میر انیس کے طرز سے زیادہ موزوں ہے۔ دبیر کی تراکیب میں ''خیال'' رنگ بھرتا ہے۔ تلمیحات سے دور کی بات قریب آجاتی ہے۔ انیس کے ہاں منظر کو دیکھنے کے لیے دماغ پر زور ڈالنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ان کی تصویر خود بولتی ہے۔ دبیر کے ہاں بات کی تہہ تک پہنچنے کے لیے دماغ پر زور ڈالنے کی ضرورت پڑتی ہے اور پھر اس سے لطف اُٹھایا جاسکتا ہے۔ مبالغہ آمیز ادراک دبیر و انیس دونوں کے ہاں ملتا ہے لیکن رزم میں انیس کا فطری میلان طبع مثنوی کی طرف ہونے کی وجہ سے وہ خطیبانہ مردانہ آہنگ پیدا نہیں ہوتا جو دبیر کا

Scanned with CamScanner

تصویر سے کی طرف فطری رجحان طبع مثنوی کی طرف ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اور جو رزمیہ شاعری سے زیادہ قریب ہے، اسی لیے مرثیے کے رزمیہ حصوں میں دبیر انیس سے زیادہ کامیاب ہیں۔ انیس منظر کشی میں جو تصویر بناتے ہیں اس میں (Touches) فطری ہیں۔ دبیر کے ہاں تاثرات (Impressions) ہیں جن پر غور کرنے سے تصویر بنتی ہے۔ ان کے ہاں خیال کی تہہ داری سے تصویر بنتی ہے۔ یہ وہی "طرزِ جدید" ہے جس کے بانی و ممتاز نمائندے ناسخ ہیں۔ یہی وہ اندازِ سخن ہے جو اس دور کا مقبول طرز تھا اور جس کی وجہ سے ناسخ عظیم شاعر، رجب علی بیگ سرور عظیم نثر نگار اور گلزارِ نسیم پسندیدہ و مقبول مثنوی تھی اور دبیر انیس سے بڑے اور اہم مرثیہ گو تھے۔ رزمیہ میں مبالغہ جتنا زیادہ ہوگا اتنا ہی بہتر ہے اور الفاظ جتنے عالمانہ و پرشکوہ ہوں گے اتنا ہی رزمیہ پرشکوہ ہوگا۔ اسی لیے مرزا دبیر رزمیہ انداز سے قریب ہیں۔ یہاں موازنے کی ضرورت نہیں ہے مگر یہ دکھانے کے لیے کہ پرشکوہ اور شان دار طرزِ ادا میں مرزا دبیر انیس سے کتنے زیادہ کامیاب ہیں، ہم ایک ہی موضوع پر دونوں کے دو دو بند نقل کرتے ہیں۔ انیس و دبیر دونوں نے حضرت عباس کو اپنے اپنے مرثیوں میں موضوعِ سخن بنایا ہے۔ انیس کا مرثیہ ع...... "آمد ہے کربلا کے نیستاں میں شیر کی" سے شروع ہوتا ہے اور دبیر کا ع...... "کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے" سے۔ پہلے انیس کے یہ دو بند پڑھیے جس میں حضرت عباس کی سواری کو دکھایا گیا ہے:

آمد ہے کربلا کے نیستاں میں شیر کی ڈیوڑھی سے چل چکی ہے سواری دلیر کی
جاسوس کہہ رہے ہیں نہیں راہ پھیر کی غش آ گیا ہے شہ کو، یہ ہے وجہ دیر کی
خوش بو ہے دشت، بادِ بہاری قریب ہے
ہشیار غافلو کہ سواری قریب ہے

آتا ہے وہ جری جو ہزاروں میں فرد ہے شیروں کا شیر عازمِ دشتِ نبرد ہے
دہشت سے آفتاب کا چہرہ بھی زرد ہے بڑھ کر پرے سے جو اسے روکے، وہ مرد ہے
سر بر کوئی ہوا نہیں اس خاندان سے
گھر میں انھی کے اُتری ہے تیغ آسمان سے

اب اس کے بعد دبیر کے یہ دو بند پڑھیے:

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے رستم کا جگر زیرِ کفن کانپ رہا ہے
ہر قصرِ سلاطینِ زمن کانپ رہا ہے سب ایک طرف، چرخِ کہن کانپ رہا ہے
شمشیر بکف دیکھ کے حیدر کے پسر کو
جبریل لرزتے ہیں سمیٹے ہوئے پر کو

ہیبت سے ہیں نہ قلعۂ افلاک کے در بند جلاد فلک بھی نظر آتا ہے نظر بند

وا ہے کمرِ چرخ سے جوزا کا کمر بند سیارے ہیں غلطاں صفتِ طائرِ پر بند

انگشت عطارد سے قلم چھوٹ پڑا ہے
خورشید کے پنجے سے علم چھوٹ پڑا ہے

انیس کے لہجے میں یہاں بھی وہی نرمی اور نسائیت اور دبیر کے لہجے میں وہی مردانہ پن اور خطیبانہ بلند آہنگی اور الفاظ کے جماؤ کا وہی شکوہ ہے جسے ہم صبح کے منظر میں پچھلے صفحات میں دیکھ چکے ہیں۔ دبیر کا یہ لہجہ اور طرز ادا رزمیہ کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ اس طرز ادا میں نکتہ سنجی ہے۔ یہاں غیر مشابہہ چیزوں میں مشابہت پیدا کی جارہی ہے۔ اس میں مرکب ادراک (Unified Sensibility) سے مرکب اثر پیدا ہو رہا ہے۔ یہ وہ رعایتِ لفظی نہیں ہے جس کے حوالے سے شبلی نعمانی دبیر کو مطعون کرتے ہیں بلکہ یہ ''مرکب اثر'' پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ شبلی ان خصوصیات کو مرزا دبیر کے ہاں دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ''مرزا دبیر میں اصلی مابہ الامتیاز جو چیز ہے وہ خیال بندی اور دقت پسندی ہے۔ یہی چیز مرزا صاحب کے تاجِ کمال کا طُرّہ ہے۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ مرزا صاحب کی قوتِ متخیلہ نہایت زبردست ہے۔ وہ اس قدر دور کے استعارات اور تشبیہات ڈھونڈھ کر پیدا کرتے ہیں کہ وہاں تک ان کے حریفوں کا طائرِ وہم پرواز نہیں کرسکتا۔ راست نما اور دل فریب استدلال، جو شاعری کا ایک جزو اعظم ہے ان کے ہاں نہایت کثرت سے پایا جاتا ہے۔ وہ قوتِ متخیلہ کے زور سے نئے نئے اور عجیب دعوے کرتے ہیں اور خیالی استدلال سے ثابت کرتے ہیں۔ مبالغے کے مضامین کو..... وہ اس قدر ترقی دیتے ہیں کہ پہلے مبالغے ان کے مقابلے میں ہیچ ہو جاتے ہیں'' [۲۷] اور یہ کہہ کر لکھا کہ ''خیال آفرینی، دقت پسندی، جدتِ استعارات، اختراعِ تشبیہات، شاعرانہ استدلال، شدت مبالغہ میں اُن (مرزا دبیر) کا جواب نہیں'' [۲۸]۔ بہر حال دونوں کے راستے، دونوں کے طرز الگ الگ اور جدا ہیں۔ ''دبیر ایک روشِ خاص کے مخترع تھے اور خاتم بھی۔ ان کی نئی نئی تشبیہیں اور اچھوتے استعارے گنجینۂ معنی کا طلسم ہیں'' [۲۹]۔ یہ رنگ اس دور کا مقبول و پسندیدہ رنگِ سخن تھا اور دبیر اس رنگ کے منفرد نمائندے تھے۔ انیس کی مصوری بقول ڈاکٹر احسن فاروقی فوٹو گرافی ہے۔ دبیر کی مصوری تجریدی ہے۔ دبیر کی قوتِ متخیلہ اسی لیے انیس سے مختلف ہے۔ جیسے ملٹن نے ڈون اور اس کے اسکول کے شاعروں کو Our Late Eccentric کہا تھا، اسی طرح شبلی نعمانی نے دبیر کی شاعری کو ''محض فرضی خیال'' کہا تھا لیکن اسی ڈون کی شاعری کو جب عہد حاضر کے حوالے سے ٹی ایس ایلیٹ نے دیکھا تو اسے اس میں ایک ایسا ''ادراک'' نظر آیا جو عہدِ حاضر کی تہہ داریوں اور پیچیدگیوں کا زیادہ بہتر طور پر اظہار کرسکتا ہے۔ دبیر کے مرثیے تو، انیس اور دوسرے مرثیہ گویوں کے مرثیوں کی طرح اپنے دور کے مسلکی مرثیوں کی روایت میں محصور ہیں لیکن ان کے الگ الگ حصوں کے انتخاب سے ہمارا جدید دور کا شاعر یقیناً استفادہ کرسکتا ہے۔ میں نے یہاں مرثیے کو شعر و ادب کے حوالے سے دیکھا ہے اور یہی وہ معیار ہے جس سے مرثیہ کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے ورنہ بصورتِ دیگر اردو مرثیہ بھی ان بے شمار

Scanned with CamScanner

مولود ناموں اور معراج ناموں کی طرح ہو کر رہ جائے گا جن کا ادب کی تاریخ میں کوئی ذکر بھی نہیں کرتا۔

اب اس بحث سے جو نتیجہ برآمد ہوا یہ ہے کہ مرزا دبیر کا ایک الگ و مخصوص شاعرانہ مزاج ہے اور یہ مزاج انیسؔ کے ادراک سے مختلف ہے۔ مرزا دبیر کے ہاں شکوہِ الفاظ بلند آہنگ مردانہ لہجہ اور مبالغہ آمیز ادراک سے وہ طرز وجود میں آیا ہے جو رزمیہ کا طرز ہے اور جسے ہم پرشکوہ اور شان دار طرز کہہ سکتے ہیں۔ میر انیس کے رزمیہ حصوں میں نرمی اور دھیما پن ہے۔ مرزا دبیرؔ کے رزمیہ حصوں میں مردانہ پن کا احساس ہوتا ہے۔ یہ دو الگ الگ مزاج ہیں اور ان سے دو الگ الگ رنگ اور طرز پیدا ہوئے ہیں۔ میر انیس کے ہاں ''بزم'' کا مزاج انھیں عظمت کی بلندیوں پر لے جاتا ہے اور مرزا دبیر کے ہاں ''رزم'' کا مزاج ''علویت'' پیدا کرتا ہے۔ میر انیس مثنوی کی روایت کے مرثیہ گو ہیں۔ مرزا دبیر قصیدے کی روایت کے مرثیہ گو ہیں۔ مثنوی کے مزاج کے باعث میر انیس کا تخیل، جدید معنی میں، ''رومانی'' ہو جاتا ہے اور قصیدے کے مزاج کی وجہ سے مرزا دبیر کا تخیل ''ذہنی اور حکیمانہ'' ہو جاتا ہے۔ میر انیس کے لہجے کا ترنم دھیما اور شیریں ہے۔ مرزا دبیر کا ترنم گرجتا ہوا سا اور تیز رفتار ہے۔ انیس سلاست وصفائی اور جوش و رنگینی کے خدائے سخن ہیں۔ دبیر خیال آفرینی، تخلیق معانی، تہہ داری، نئی امیجری (Imagery) جدت استعارات اور اختراعِ تشبیہات کے خدائے سخن ہیں۔ مرزا دبیر کا مزاج مابعد الطبیعیاتی مزاج ہے۔ مرزا دبیر عہد حاضر کے شعور و ادراک سے ویسے ہی قریب ہیں جیسے میر انیس سرسید اور مولانا حالی کے دور کی روایت سے قریب تھے۔ ان دونوں کے رنگ، مزاج اور راستے الگ اور جدا ہیں اور اس طرح ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا صحیح نہیں ہے[۳۰]۔

[۳]

مرزا دبیر کی شاعری کے بارے میں دو باتیں ذہن میں رہنی چاہئیں۔ ایک یہ کہ وہ بہت زود گو شاعر اور بہت مصروف انسان تھے اور اسی وجہ سے، میر انیس کی طرح، ہر ہر مصرع کی نوک پلک درست کرنے کی نہ انھیں فرصت تھی اور نہ یہ ان کا مزاج تھا۔ اسی لیے فن کے لحاظ سے وہ لاپرواہ شاعر نظر آتے ہیں اور جودت طبع کے باوجود ان کے کلام میں فن کی ایسی ناہمواری موجود ہے جو اکثر ناگوار گزرتی ہے مگر ان کے ہاں تنوع ہے۔ وہ انیس کے رنگ میں مرثیہ لکھنے پر قادر ہیں۔ مرزا دبیر کے حامیوں (دبیریوں) نے شبلی کی ''موازنہ'' کے جواب میں یہ واضح کیا کہ جو خصوصیات شبلی نے میر انیس کے ہاں دکھائی ہیں وہ سب کی سب مرزا دبیر کے ہاں بھی موجود ہیں۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ جو کچھ طرزِ انیسؔ میں دبیرؔ نے لکھا کیا وہاں وہ زیادہ سے زیادہ انیس جیسے ہو جاتے ہیں لیکن انیس سے آگے نہیں جاتے۔ یہاں وہ طرز انیس کی اسی طرح تکرار کرتے ہیں جیسے انیس کے بیٹے اپنے باپ کے رنگ میں لکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ جیسے انیسؔ دبیرؔ کے رنگ میں کہہ کر دبیر سے آگے

Scanned with CamScanner

نہیں جاسکتے تھے اسی طرح دبیر انیس کے طرز میں انیس کی طرح کے شعر لکھ کر ان سے آگے نہیں نکلے اور یہی اصل بات ہے۔ یہ دونوں اپنے اپنے رنگ وطرز کے منفرد نمائندے ہیں اور یہی رنگ وطرز ان کی پہچان ہے۔ دوسری بات یہ بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ انیس ایک نامی گرامی تہذیب یافتہ خاندان کے فرد ضرور تھے مگر علم کے اعتبار سے دبیر کا رتبہ بلند ہے۔ وہ بلاشبہ انیس سے کہیں زیادہ عالم تھے [۳۱]۔

اردو مرثیہ بنیادی طور پر مسکی مرثیہ ہے۔ اس کا مقصد اہل مجلس کو رُلانا ہے تاکہ رونے سے وہ ثواب حاصل کرسکیں۔ مسکی مرثیہ امام حسین اور ان کے انصاروں کی مدح اسی طرح کرنا چاہتا ہے جس طرح قصیدے میں کی جاتی ہے اور ان کے حالات کو اسی طرح بیان کرنا چاہتا ہے جیسے مثنوی میں بیان کیے جاتے ہیں۔ مثنوی میں واقعہ بیان کرنے والا پابند نہیں ہوتا۔ وہ عیش ونشاط کے مناظر بھی دکھا سکتا ہے مگر مذہبی مقصد کے باعث چونکہ مرثیے میں بین و بکا سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے اس لیے جو واقعات بیان کیے جاتے ہیں وہ بھی غم انگیز ہوتے ہیں۔ مدح جیسی مرزا دبیر کے ہاں ملتی ہے بہت مبالغہ آمیز ہے۔ اس مبالغے میں ان کی علمیت اور تلمیحات وکنایات رنگ بھرتے ہیں اور جیسا کہ ہم لکھ آئے ہیں یہ مرزا دبیر کا مزاج ہے اور یہ رنگ قصیدہ گوئی کا رنگ ہے۔ میر انیس اس میدان میں اپنے مزاج ورنگ سخن کی وجہ سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ میر انیس کا مزاج انھیں مثنوی کی طرف لے جاتا ہے، اس لیے واقعہ نگاری میں وہ دبیر سے آگے ہیں۔ یہ رنگ طبع ومزاج کی سطح پر دونوں کا مطالعہ ہوا لیکن دونوں مبالغہ اور واقعہ نگاری میں مسکی مرثیے کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔ واقعہ نگاری میں مرزا دبیر اور میر انیس دونوں ایسے فرضی اور من گھڑت واقعات کو اثر آفرینی اور مسکی اثر پیدا کرنے کے لیے شامل کرلیتے ہیں جو بے بنیاد ہیں لیکن مسکی اثر اور رُلانے کے عمل کے لیے مفید مطلب ہیں۔ واقعہ نگاری میں مختلف مناظر بھی آتے ہیں۔ مکالمے بھی ہوتے ہیں۔ امام حسین کا مدینہ سے رخصت ہونا اور حضرت صغرا کے حال کا منظر عام ہے۔ اسی طرح مرثیے میں کسی نہ کسی طرح سے رخصت طلب کرنے کا منظر بھی بیان میں آتا ہے۔ کربلا پہنچ کر نہر کے کنارے خیمہ زن ہونے کا منظر بھی عام ہے۔ رخصت کے واقعات میں مرزا دبیر نے بھی ایسی باتیں گرمی پیدا کرنے کے لیے خود گھڑی ہیں جو قرین قیاس بھی نہیں ہیں اور امام حسین کے اصحاب کی یک جہتی اور مقصد اعلیٰ کو دیکھتے ہوئے قطعی نامناسب ہیں مثلاً حضرت عباس کو علم ملنے پر حضرت عون ومحمد کا ناراض ہوکر واویلا کرنا۔ یہ ورثہ کا وہ جھگڑا ہے جو شیعہ عقیدے کا ایک جزو بن گیا ہے۔ مرزا دبیر بھی اس جھگڑے کو سامنے لاتے ہیں اور میر انیس بھی۔ میر انیس حضرت عون ومحمد کا یہ جھگڑا دکھاتے ہیں جسے حضرت زینب طے کردیتی ہیں۔ مرزا دبیر اس واقعہ میں عمر سعد کی خیالی سازش اور جاسوسی کو شامل کرکے رنگ بھرتے ہیں۔ ان واقعات کے بیان میں مستورات کی باتیں رقم کی جاتی ہیں۔ ایسے موقع پر حضرت صغریٰ، حضرت شہربانو اور حضرت زینب سب ہی باتیں کرتی ہوئی سامنے آتی ہیں۔ مرزا دبیر جاسوسی وسازش کے تعلق سے حضرت زینب کی گفتگو مرثیے میں یوں لکھتے ہیں:

دوڑی وفورِ طیش سے خود زینبِ حزیں فرمایا میں تو آنے کو تھی ننگے سر وہیں
کیا مشورہ تھا شمر سے، وہ بولے کچھ نہیں فرمایا خوب لوگوں میں چرچا ہے پھر یونہیں
شمرِ لعیں نے صلح جو ٹھہرائی ہوئے گی
مرضی تمھاری تھوڑی بہت پائی ہوئے گی

ہے ہے مجھے تو اور ہی وسواس اب ہوا شاید علَم نہ ملنے کا تم کو تعب ہوا
عباس کو ملا جو علم کیا غضب ہوا گزرا جو ناگوار خلافِ ادب ہوا
آئے کوئی بلا نہ پدر کی کمائی پر
قربان تم ہوئے مرے عباس بھائی پر

قبلہ کو ہاتھ اُٹھا کے پکارے وہ مہ لقا اماں بربِّ کعبہ کہ خادم ہیں بے خطا
سن لیجیے حضور تو پھر ہو جئے خفا جن کو حضور پالیں گی وہ ہوں گے بے وفا؟
چاروں ملک جو مالک تقریر سے پھریں
ہم دونوں بھائی حضرت شبیر سے پھریں

ورثے کا یہ جھگڑا چونکہ شیعہ عقیدہ کا حصہ ہے اس لیے مرثیہ گو بار بار اسے پیش کر کے اہلِ مجلس کے جذباتِ عقیدت کو آسودہ کرتے ہیں اور ایسے موقع پر بھول جاتے ہیں کہ حضرت عون و محمد کمسن و ناتجربہ کار ہیں اور ان کے برخلاف حضرت عباس تجربہ کار اور شجاع ہیں اور موقع و محل کے مطابق وہی اس کے حق دار ہیں لیکن اس سے نہ مرثیہ گو کو کوئی غرض ہے اور نہ اہلِ مجلس کو۔ اس سطح پر اُردو مرثیہ ایک وقتی و عارضی چیز بن کر رہ جاتا ہے۔ ان واقعیاتی حصوں میں انسانی نفسیات کا جو اظہار ہوتا ہے وہ بھی غیر واقعیاتی ہے۔ ایسے میں اصل اور بنیادی سوال یہ ہے کہ مرثیہ نگاروں نے کس قسم کے جذبات کی ترجمانی کی ہے اور ان سے کہاں تک نفسیاتی تاثرات پیدا ہوتے ہیں۔ مدینہ سے رخصت ہوتے وقت حضرت صغریٰ اور تمام اہل بیت کی حالت و کیفیت مرزا دبیر اور میر انیس دونوں نے دکھائی ہے۔ حضرت علی اکبر کے رخصت ہونے اور ماں اور پھوپھی کے جذبات کا حال بھی ان دونوں کے ہاں ملتا ہے۔ حضرت عباس کی شہادت پر امام حسین کی حالت، امام حسین کی شہادت پر حضرت زینب کا بال کھولے ہوئے باہر آجانا اور بین کرنا یہ سب ہی مرثیہ گویوں کے ہاں عام طور پر ملتا ہے۔ مرزا دبیر حضرت علی اکبر کی رخصت کے سلسلے میں یہ دکھاتے ہیں کہ وہ ماں سے اجازت تو لیتے ہیں مگر پھوپھی حضرت زینب سے نہیں۔ یہ بات انھیں بہت روحانی تکلیف پہنچاتی ہے۔ مرزا دبیر ان کی یہ کیفیت کئی بندوں میں پیش کرتے ہیں:

اکبر کے سنانے کو یہ کہتی تھیں زباں سے اے عون و محمد تمھیں لاؤں میں کہاں سے
جو کام کیا پوچھ کے مجھ سوختہ جاں سے اب قدر ہوئی پیاروں کی جب چھٹ گئے ان سے

Scanned with CamScanner

کیا جان کے دم بھرتی تھی ہم شکل نبی کا
سب کہنے کی باتیں ہیں نہیں کوئی کسی کا

پھر بانو کے پاس آکے یہ فرمایا بہ رقت لو بھائی یہ ملبوس یہ اکبر کی امانت
بچپن کے بھی کُرتے ہیں جوانی کی بھی خلعت اللہ مبارک کرے اب تم کو یہ خدمت
تم والدہ ان کی ہو پدر سرورِ دیں ہیں
یہ آج کھلا ہم کوئی اکبر کے نہیں ہیں

پھر رونے لگیں بیٹھ کے واں زینبِ ناچار ہم شکل بنی لپٹے یہ کہتے ہوئے اک بار
میری پھوپھی اماں، مری مالک مری مختار میں تو ہوں خادم آپ کا کیوں آپ ہیں بے زار
ہم چاہتے ہیں تم ہمیں چاہو کہ نہ چاہو
اللہ اب اک بات پہ بندے سے خفا ہو

ہٹ ہٹ کے وہ بولیں کہ نہ یہ ذکر نکالو دم رُکتا ہے باہیں نہ گلے میں مرے ڈالو
ماں بیٹھی ہے وہ جاؤ گلے اس کو لگالو بانو کی خوشامد کرو مرنے کی رضا لو
میں پیار نہیں کرتی میں قرباں نہیں ہوتی
جاؤ میں تمھاری پھوپھی اماں نہیں ہوتی

جیتی رہیں بھابی وہ ہیں حق دار تمھاری میں کا ہے کو ہونے لگی مختار تمھاری
جاؤ نہ سواری تو ہے تیار تمھاری اٹھارہ برس کی ہوں پرستار تمھاری
کس سے کہوں کیا خونِ جگر پیتی ہوں ہے ہے
دل پہ تو چھری چل گئی اور جیتی ہوں ہے ہے

امام حسین کے حضرت علی اکبر کی شہادت پر جذبات یہ ہیں:

رو کے کہتے تھے نہ طاقت ہے نہ بینائی ہے بیٹا مارا گیا اور عالم تنہائی ہے
کیسی محرومی سے رستے کی طرف تکتا ہوں اُٹھ کے گر پڑتا ہوں گر کر نہیں اُٹھ سکتا ہوں
نہ کوئی ہاتھ پکڑنے کو نہ سمجھانے کو
ہم ہیں رونے کو جدائی تری رُلوانے کو

یا حضرت عباس کی لاش پر کہتے ہیں:

بھیا ہمیں آنکھوں سے بجھائی نہیں دیتا کانوں سے بھی اس وقت سنائی نہیں دیتا
تسکین ہمیں دردِ جدائی نہیں دیتا کیا ساتھ برے وقت میں بھائی نہیں دیتا
کیا لیٹے ہو اُٹھ کر مجھے مرنے سے بچادو

Scanned with CamScanner

لاشہ علی اکبر کا ہمیں چل کے دکھادو

یہ ''جذبات'' جو ان بندوں میں ظاہر ہوئے ہیں لکھنؤ کے عام لوگوں کو رلانے کے لیے مناسب ہیں۔ وہاں گھروں میں پھوپھی، بھتیجے اور ماں بیٹے وغیرہ کے جو جذبات ہو سکتے تھے ان کے زیر اثر اہلِ مجلس رونے لگتے تھے مگر بقول ڈاکٹر احسن فاروقی یہ ''جذباتیت'' ہے انھیں جذبات نہیں کہا جا سکتا اور اسی لیے مرثیے کے یہ مبکی حصے ''جذبات نگاری'' کے تعلق سے سنسنی خیزی کے ذیل میں آتے ہیں۔ پھر مرثیہ نگار اور اہلِ مجلس دونوں کو یہ احساس نہیں ہے کہ موقع کیا ہے؟ کربلا کے میدان جنگ میں جہاں سب لوگ حقِ شہادت ادا کر رہے ہیں اور عزم کا مجسمہ بنے ہوئے ہیں، وہاں گھروں میں ہونے والی تُو تُو میں میں، نند بھاوجوں کے تنازع، بڈھوں کا غم اولاد کیا معنی رکھتا ہے۔ یہاں نہ کسی ''ٹائپ'' کے جذبات ہیں اور نہ ''فرد'' کے۔ مرثیہ گو کا مقصد یہ ہے کہ وہ جذباتیت سے رقت پیدا کرے تاکہ بین و بکا سے ثواب حاصل کیا جا سکے۔ اسی لیے مرثیے کا یہ حصۂ شاعری، فنی اثر کے لحاظ سے، بے اثر ہے۔ اسی لیے حامد حسن قادری یہ سوال اُٹھاتے ہیں کہ

> ''حضرات اہل بیت علیہم الصلوٰۃ والسلام میں جو سب سے بڑے فضائل تھے وہ ان کی رضا و تسلیم، صبر و قناعت، زہد و توکل، ضبط و تحمل تھے۔ کسی قدر عجیب بات ہے کہ جو بہن اپنے بیٹوں بھائیوں شوہروں کو رضائے الٰہی پر قربان کرنے کا ہمت و حوصلہ رکھتی ہو ان کے متعلق یہ بیان کیا جائے کہ وہ ننگے سر خیمے سے باہر نکل آئیں اور اس اس طرح روئیں پیٹیں۔ اس منقبت کے ساتھ یہ منقبت کس قدر متضاد ہے۔ واقعہ کے کتنے خلاف ہے۔ مرثیے کی اخلاقی تعلیم کے کس درجہ منافی ہے۔ مرثیہ نویسی کا مقصد رونا رُلانا حاصل سہی لیکن اسوۂ حسنہ کا مدعا فوت ہو جاتا ہے۔'' [۳۲]

اور یہ بھی لکھا کہ اسی لیے مرثیے میں کردار نگاری بھی نہیں ہے:

> ''مرثیہ باوجود مسلسل داستان ہونے کے شخصی کردار (کیریکٹر) سے تقریباً خالی ہے۔ اول تو داستانِ مرثیہ میں کسی شخص کے پورے حالاتِ زندگی نہیں ہیں۔ صرف ایک واقعہ ہے۔ دوسرے کسی شخص کو اظہار کردار کے لیے آزادیِ عمل ملنی ضروری ہے اور یہاں یہ حال ہے کہ واقعۂ شہادت کی پیشن گوئی ہو چکی ہے۔ حضرت امام اور ان کے رُفقا کو اس کا علم ہے اور یہ بھی جانتے ہیں کہ اس کے پورا ہونے کا یہی وقت ہے اس لیے سب کے سب راضی بقضا ہو کر آئے ہیں۔ تیسرے یہ کہ ایک جماعت معصوم و ناقابلِ خطا ہے اور دوسرا گروہ سقی ازلی و ناری ابدی۔'' [۳۳]

مرثیے میں اہلِ بیت کی حقیقی زندگی، ان کے صبر و استقامت کی عظمتوں اور ان کی زندگی سے اخلاقی قدروں کا پھوٹنے والا نور روشن نہیں ہوتا۔ واقعۂ کربلا بلاشبہ اخلاقی نوعیت کا حامل ہے لیکن مرثیہ نگار کردار کی علویت پیش

Scanned with CamScanner

کرنے کے بجائے رونے دھونے کی طرف لگ جاتے ہیں۔ایک طرف مدحیہ حصے میں امام حسین کے صبر و رضا کی تعریف میں زمین آسمان ایک کر دیے جاتے ہیں تو دوسری طرف بے عزمی و بے صبری کا وہ عالم دکھایا جاتا ہے جیسا پچھلے صفحات میں دیے ہوئے بندوں سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ یہاں مرزا دبیر اور میر انیس دونوں کی ایک ہی سطح ہے اور دونوں کا مقصدِ مرثیہ بھی ایک ہے۔شیعہ عقیدہ نے اردو مرثیے کو جنم دیا اور عقیدے کے رسمی و مجلسی پہلو ہی نے اسے علویت تک پہنچنے نہیں دیا۔عقیدے کی رسمی ضرورت تو مرثیے نے پوری کر دی لیکن شعری سطح پر اسے مجروح کر دیا۔ جب بھی مرثیہ کا شعر و ادب کے حوالے سے مطالعہ کیا جائے گا تو یہ بات ضرور سامنے آئے گی اور کہی جائے گی۔ یہی بات مرزا رفیع سودا نے ''سبیل ہدایت'' میں کہی ہے اور یہی بات ڈاکٹر احسن فاروقی نے اپنی تنقیدی تصنیف ''مرثیہ نگاری اور میر انیس'' میں کہی ہے۔ میں نے بھی اردو مرثیے کا ''تاریخ ادب'' میں ادب و شعر کے تعلق ہی سے مطالعہ کیا ہے۔

حضرات امام حسین اور ان کے انصار بلا شبہ اخلاق کے بہترین نمونہ تھے۔سوال یہ ہے کہ کیا اردو مرثیے میں انھیں اخلاق کے مثالی روپ میں پیش کیا گیا ہے؟ یقیناً ایسے بند بھی ملتے ہیں جن میں وفاداری، شجاعت، ایثار، شہادت و صبر کے مضامین اسی طرح باندھے گئے ہیں جیسے ہمارے قصیدوں یا غزلوں میں باندھے جاتے ہیں مگر جب ان عظیم ہستیوں کو راہِ عمل (Inaction) میں دکھایا جاتا ہے تو وہ رسوم میں جکڑے ایک عام سے انسان کی طرح شکست خوردہ و پسپا، ورثے کے تنازع، نند بھاوج کے جھگڑے میں پھنسے، روتے دھوتے دکھائی دیتے ہیں۔حضرت عباس کی شہادت پر امام حسین کے بارے میں دبیر لکھتے ہیں:

ع..... ''لاشے پہ تھرتھرا کے گرے شاہ نامدار''

ع..... ''شانوں کا خون چہرے پہ مَل مَل کے روتے تھے''

اکبر کے سہارے سے چلے نہر پہ آقا گہ ہوش تھا گہ غش کبھی سکتہ کبھی نوحا

حضرت زینب فرماتی ہیں:

زینب نے کہا زندہ ہیں عباسِ خوش خصال تم جاؤ میں یاں بہرِ شفا کھولتی ہوں بال

حضرت عباس نے دم توڑتے وقت:

اس جان شکنی میں جو سنا شیونِ مولا تعظیم کی نیت میں کٹے شانوں کو ٹیکا

در پر تھیں نبی زادیاں سب کھولے ہوئے سر

حضرت اکبر بوقت شہادت کہتے ہیں:

کہتے ہیں کہ میدان سے ناحق میں گھر آیا مرتے ہوئے اماں کا کھلا سر نظر آیا

حضرت زینب فرماتی ہیں:

بھابی جو کہیں یہ، وہ کرو، ان کو مناؤ سر اچھی طرح ڈھانپ لو تو سامنے آؤ

Scanned with CamScanner

حضرت شہر بانو، حضرت علی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہیں:

اب کس کے منانے کے لیے ڈھانپوں میں سر کو　　گھر لٹتا ہے، ہے ہے میں نکل جاؤں کدھر کو
بانو نے کہا یوسف شبیر ہوا گم　　کیوں شیرِ خدا لے چلے بیٹے کو مرے تم
اس کو کہ جلی کی تو نہ فریاد کو پہنچے　　دم توڑتے میں پوتے کی امداد کو پہنچے

میدانِ جنگ میں حضرت امام حسین حضرت علی کی تلوار ''ذوالفقار'' سے مکالمہ کرتے ہیں۔ ذوالفقار کہتی ہے کہ اب وہ اس وقت دم لے گی جب شمر کو بے دم کر چکی ہوگی لیکن امام مظلوم نے فرمایا کہ یہ خدا کی رضا نہیں ہے ع..... میری قضا ہے، شمر کی اس دم قضا نہیں۔ یہ سن کر ذوالفقار:

روتی ہوئی وہ تیغ در آئی نیام میں　　اور شاہِ بے سپاہ گھرے فوجِ شام میں

اس کے بعد یہ بند آتے ہیں:

پر آہ آہ شمر نے بڑھ کر غضب کیا　　سینے میں موزہ، حلق پہ خنجر کو رکھ دیا
چلاتے آئے قبر سے محبوبِ کبریا　　بانہیں گلے میں ڈال دیں خنجر پکڑ لیا

زہرا پکاری، یہ دلِ حیدر کا چین ہے
میرا حسین ہے ارے میرا حسین ہے

مڑ مڑ کے زیرِ تیغ یہ بولے شہ امم　　زینب تجھے شہادتِ شبیر کی قسم
لے جا مرے یتیموں کو خیمے میں ایک دم　　بٹتا ہے دھیان، محوِ جمالِ خدا ہیں ہم

بچوں کو لے کے ڈیوڑھی سے زینب تو ہٹ گئی
یاں بوسہ گاہِ احمدِ مختار کٹ گئی

حضرت امام حسین، جناب زینب، جناب شہر بانو، حضرت اکبر اور حضرت عباس کی سی عظیم ہستیوں کو مرثیہ گو اودھ کے پاپیادہ سپاہی اور لکھنؤ کی عام عورت کی سطح پر لے آتا ہے اور یہ اس لیے کرتا ہے کہ بین و بکا سے اہلِ مجلس متاب کر سکیں۔ عظیم اخلاقی کردار کا تصور نہ سامعین کے ذہن میں تھا اور نہ مرثیہ گو مرزا دبیر کے۔ واقعۂ کربلا ایک عظیم واقعہ ہے اور اسی لیے اس کا بیان، موضوع کے اعتبار سے، عظیم ہے لیکن مرثیہ گویوں نے جس طرح اسے برتا اور دکھایا ہے وہ ان عظیم ہستیوں کے تعلق سے عظیم نہیں ہے۔

پچھلے صفحات میں ہم میرزا دبیر اور میر انیس کی شاعری کی انفرادیت اور ان دونوں کے تخلیقی مزاج کے فرق کو واضح کر آئے ہیں۔ یہ بھی لکھ چکے ہیں کہ ان دونوں کے ادراک ایک دوسرے سے مختلف و متضاد ہیں۔ مرزا دبیر اپنے مخصوص ادراک کے ساتھ کہتے ہیں:

اے دبدبۂ نظم دو عالم کو ہلا دے　　اے طنطنۂ طبع جزو کل کو ملا دے
اے معجزۂ فکر فصاحت کو جلا دے　　اے زمزمۂ نطق بلاغت کا صلا دے

Scanned with CamScanner

اے بائے بیاں معنیِ تسخیر کو حل کر
اے سین سخن قاف سے تا قاف عمل کر

مرزا دبیر معنی آفرینی کو اہم قرار دیتے اور مضمون پر زور دیتے ہیں بع..... مضمون نئے کرتا ہوں میں ایجاد ہمیشہ:

حامی جو سلیمانِ دوعالم نظر آئے — مضمون جو عنقا تھے وہ پر جوڑ کر آئے
طاؤسِ تصور کی طرح دل میں در آئے — شیشے میں پری زاد معانی اُتر آئے

یاقوت بدخشاں سے، دُر آتے ہیں عدن سے
لعل اُگلوں گا میں طوطی سدرہ کے دہن سے

دبیر کی شاعری میں گرجتا، بلند آہنگ لہجہ سنائی دیتا ہے۔ وہ مضمون پیدا کرنے کے لیے متضاد پہلوؤں میں ایسی مناسبتیں تلاش کرتے ہیں کہ خیال و معنی فطری پن کے ساتھ ایک جان ہو جاتے ہیں۔ مرزا دبیر نے ناسخ کے ''طرز جدید'' کو مرثیے میں برت کر ایک بہت مشکل کام کو طویل نظم (مرثیہ) میں آسان کر دکھایا ہے۔ اردو مرثیے کے تعلق سے اردو شاعری میں یہ بھی دبیر کی انفرادیت ہے۔ یہی وہ خصوصیت ہے جسے ڈاکٹر احسن فاروقی نے ''مابعد طبیعیاتی ادراک'' کا نام دیا ہے۔

مرزا دبیر کے ہاں زورِ طبع اور تخلیقی قوت کی فراوانی کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ان کا مزاج انھیں جدتوں کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ جدتیں عروضی سطح پر نہیں ہیں بلکہ شعری پیکروں اور خیالی شبیہوں (Images) میں ظاہر ہوتی ہیں جہاں ''طاؤسِ تصور'' کی رنگارنگی تہہ دار، پیچیدہ معنی کو سامنے لاتی ہے اور یہی ان کے مرثیے کا مزاج ہے۔

مرزا دبیر کے کلام میں الحاقی کلام بھی شامل ہو گیا ہے۔ مرزا دبیر سے منسوب یہ مصرع: ''فرمایا میں حسین علیہ السلام ہوں'' یا یہ مصرع: ''نانا ہوں حسین علیہ السلام کا''۔ جن پر شبلی نعمانی نے ''موازنہ'' میں اعتراض کیا تھا اور صحیح کیا تھا، دبیر کے نہیں بلکہ الحاقی ہیں [۳۴]۔ جب سامعین مرثیہ کہتے ہیں کہ میر انیس کے کلام میں ''فصاحت'' ہے اور مرزا دبیر کے ہاں ''بلاغت'' ہے تو ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دبیر کا کلام پیچیدہ و تہہ دار ہے۔ اس میں تشبیہات و استعارات علمی اور کتابی ہیں۔ عام پڑھے لکھے آدمی کے ذہن میں فصاحت کے معنی ''سادہ'' اور بلاغت کے معنی ''مشکل'' کے ہوتے ہیں۔ یہ وہی طرز ادا ہے جسے مابعد الطبیعیاتی کہا گیا ہے۔ مابعد الطبیعیاتی ذہن عالم کا ذہن ہوتا ہے جو معمولی چیزوں کو عالمانہ اندازِ نظر سے اشیاء سے ملا دیتا ہے۔ خیال بند شعرا جیسے غنی کاشمیری کا ذہن اسی طرح کام کرتا ہے جیسے مرثیہ میں دبیر کا ذہن کام کرتا ہے۔ صنائع بدائع کے استعمال میں بھی مرزا دبیر کا معیار وہ نہیں ہے جو میر انیس کا ہے: ع..... سامعین جلد سمجھ لیں جسے صنعت ہو وہی۔ دبیر کا معیار یہ ہے کہ وہ عنقا مضامین کو اس طرح باندھیں کہ پری زادِ معانی شیشے میں اُتر آئے:

مضمون جو عنقا تھے وہ پر جوڑ کر آئے — شیشے میں پری زادِ معانی اُتر آئے

Scanned with CamScanner

مرزا دبیر کے ہاں ایسے بند ملیں گے جن میں میر انیس کا رنگ نمایاں ہے۔ ''موازنہ انیس و دبیر'' کا جواب دینے والے حامیانِ دبیر نے اُن کے کلام سے ایسی مثالوں کا ڈھیر لگا دیا ہے جن میں تشبیہات و استعارات اور ''فصاحت'' لیے انداز بیان میر انیس جیسے ہیں لیکن دراصل یہ حصۂ کلام مرزا دبیر کا انفرادی رنگ نہیں ہے۔ ان کی انفرادیت اسی رنگ میں ہے جس میں عنقا مضامین کو شیشے میں اُتارا جاتا ہے۔ دبیر کا کلام اُن اہلِ مجلس کے لیے تھا جو طبقۂ خواص سے تعلق رکھتے تھے اور جو انیس کا نہیں دبیر کا مرثیہ پسند کرتے تھے جس میں ندرت بیانی اور جدت آفرینی پر زور تھا:

قافِ غروب کو ہوا سیمرغ شب رواں — دارالامانِ صبح نے لی روز میں اماں
خالی ہوا طُیورِ کواکب سے آسماں — اک بیضۂ قمر تھا فلک پر فقط عیاں

پروانے مرغِ شمع صفت پر بُریدہ تھے
بسمل کی شکل طائرِ ذرّہ طپیدہ تھے

یہاں استعارہ تہہ دار ہے، خیال بھی پے چیدہ ہے۔ عام الفاظ بھی استعمال میں نہیں آئے ہیں لیکن زورِ طبع نے روانی کو قائم رکھا ہے۔ مبالغہ ہر بیان میں موجود ہے۔ عربی و فارسی شاعری کا یہی مخصوص مبالغہ آمیز ادراک بقول ڈاکٹر احسن فاروقی اردو شاعری کا بھی طرۂ امتیاز ہے۔ عام مذاقِ سخن میں جب کسی شعر کو دوسرے شعر سے بہتر بتایا جاتا ہے تو بہتر اسے کہا جاتا ہے جس میں شاعرانہ مبالغہ زیادہ ہو۔ اس طرح شاعری ایک طرح سے حقیقت سے دور لے جانے کا نام تھا۔ یہی معیارِ سخن اردو شاعروں کے سامنے تھا۔ میر انیس ان شاعروں میں تھے جو مبالغے میں بہت دور نہیں جاسکتے تھے، اسی لیے ان کے زمانے نے انھیں مرزا دبیر سے بہتر نہیں جانا۔ مبالغہ آمیز ادراک میں، جو قصیدہ کا مزاج ہے، مرزا دبیر بہت آگے ہیں اور اردو شاعری کی روایت کو آسمان پر پہنچا دیتے ہیں۔ مرزا دبیر کے سارے شعری پیکر اور خیالی شبیہیں (Imagery) ایسی ہیں جن تک پہنچنے کے لیے قاری یا سامع کو دماغ لگانا پڑتا ہے۔ مرزا دبیر قوتِ تخئیل کے امتزاج سے غیر مشابہہ چیزوں میں مشابہت پیدا کر دیتے ہیں۔ اس سے ان کی شاعری میں ایک نیا زور ایک نئی شان اور شکوہ پیدا ہو گیا ہے۔ یہی مرزا دبیر کے طرز کا کمال ہے۔ ان کی مخصوص امیجری کو سمجھنے کے لیے مختلف مراثی سے لیے ہوئے یہ چند شعر پڑھیے:

(۱) تیغِ عباس جو دامانِ زرہ میں تھی نہاں — یا شبستاں میں وہ خوابیدہ تھا مارِ دو زباں
(۲) چمکا وہ ہلال ابروئے یوسف کا کنویں سے — یا برق جدا ہوگئی بادل کے دھوئیں سے
(۳) نبضیں چھٹیں شرر کی سقر کانپنے لگے — شعلے زباں نکال کے خود ہانپنے لگے
(۴) تھا چاہِ ذقن میں چہِ نخشب کا تجلا — اس چاہ کی کشتی نے تو پانی بھی نہ مانگا

مجرد خیال مرزا دبیر کے رنگ سخن کا جوہر ہے۔ میر انیس نے بھی شکوہِ الفاظ کو اپنے مرثیے کے رزمیہ حصوں میں برتا ہے لیکن ان کے الفاظ کا ترنم علویت لیے ہوئے شان دار (Grand) اثر پیدا نہیں کرتا۔ معرکوں کے بیان

Scanned with CamScanner

میں مرزا دبیر کا یہ ترنم عجیب تاثیر رکھتا ہے اور دور دراز تشبیہات، تلمیحات و استعارات کے ساتھ پرشکوہ الفاظ کا ترنم ایک نئے عالم میں لے جاتا ہے جو ہماری عام دنیا سے زیادہ عجیب اور غریب ہے۔ اس ترنم یا راگ کا تنوع دیکھنے کے لیے یہ بند بآواز بلند پڑھیے۔ مرثیہ اکیلے میں پڑھنے کی چیز نہیں ہے۔ اس سے لطف اندوز ہونے کے لیے بلند آواز سے پڑھنے کی ضرورت ہے:

میداں سے صفیں بھاگ گئیں فوجِ لعیں کی — بس رہ گئی ماتھے پہ صفیں چینِ جبیں کی
ضربت تھی غضب بازوئے شاہنشہِ دیں کی — ہر بار لچکتی تھی کمر گاوِ زمیں کی
چھپتی تھی زمیں شہپر جبریل امیں کی
جبریل فلک میں تو فلک گاوِ زمیں میں

اس بند میں حرکت اور تیزی سے آگے بڑھنے کا احساس اس ترنم سے ہو رہا ہے جو طرزِ ادا کے اندر چھپا ہوا ہے۔ یہ آہنگ آپ کو میر انیس کے ہاں محسوس نہیں ہوگا۔ الفاظ اور معنی کی تہہ داری کے ساتھ طرزِ ادا کا یہ شکوہ دبیر کی انفرادیت ہے۔ اگر کہیں مرثیہ کہیں ایپک شاعری کا ہم طرح کہا جا سکتا ہے تو وہ مرزا دبیر کی شاعری کے بہترین و منتخب حصوں کی وجہ سے کہا جا سکتا ہے۔ جیسے انشاء اللہ خاں انشا کی شاعری کا مردانہ لہجہ ہمارے شاعروں نے استعمال کر کے نہیں دیکھا، اسی طرح مرزا دبیر کا یہ پُرشکوہ ترنم والا اسلوب اب تک پوری طرح تصرف میں نہیں آیا۔ یہی ترنم یا راگ ناسخ کی چند غزلوں میں بھی موجود ہے جس کو دبیر اپنے مرثیے میں سنبھالتے سنوارتے ہیں اور جسے اقبال نے بھی اپنے ہاں استعمال کیا ہے۔ حامد حسن قادری کا یہ کہنا درست ہے کہ انیس و دبیر کے ''مرثیوں میں ادبی جواہر پارے جس کثرت سے جمع ہیں اتنے کسی دیوان، کسی مثنوی، کسی مجموعۂ قصائد میں نہیں ہیں۔ کسی شاعر نے اتنے الفاظ استعمال نہیں کیے (نظیر اکبر آبادی کے سوا) جتنے میر انیس یا مرزا دبیر نے کیے ہیں۔ روزمرہ، محاورات، امثال و تلمیحات استعارات و تشبیہات جس قدر کثرت و خوبی کے ساتھ (ان) مرثیہ گویوں نے برتے ہیں عدیم النظیر ہیں۔ طرزِ ادا و اسلوب کی بلاغت و جدت، تخیل و مضمون آفرینی کی رفعت و لطافت جیسی (ان) شعرائے مرثیہ کے ہاں موجود ہے کہیں نظر نہیں آتی'' [۳۵]۔ انیس و دبیر دونوں خدائے سخن ہیں اور یہ مشکل ہے کہ ان دونوں خداؤں میں سے کسی کو خدائے برتر کہا جائے۔ میر انیس سلاست و صفائی، سادگی و رنگینی کے اور مرزا دبیر طبع کی روانی، علمیت، مضمون آفرینی، معنی خیزی اور پرشکوہ و شان دار اسلوب کے نمائندے و ترجمان ہیں۔ شبلی نے انیس کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ اپنی جگہ صحیح و درست ہے لیکن دبیر کے تعلق سے ان سے یہ چوک ہوئی کہ انیس کا تو انھوں نے بہترین کلام سامنے رکھا اور اس کا مقابلہ دبیر کے کمزور کلام سے کیا۔ میر انیس کے سلسلے میں مولانا حالی نے یہ دیکھ لیا تھا کہ جدید دور میں نیچرل شاعری کی مثال میر انیس کے ہاں ملتی ہے اس لیے حالی و شبلی کے دور میں میر انیس ''جدید'' تسلیم کیے گئے اور انھیں جدید شاعری کا پیش رو قرار دیا گیا۔ حالی نے ''مسدسِ حالی'' اور اپنی نیچرل شاعری میں انیس ہی کی روایت

Scanned with CamScanner

سے استفادہ کیا ہے۔ دبیر کے رنگِ سخن کو کوئی حالی نہ ملا اور وجہ اس کی یہ تھی کہ مغلیہ تہذیب، جس کا ایک اہم و بڑا جزیرہ لکھنؤ تھا، ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر چکی تھی اور انگریزی اقتدار و حاکمیت کے ساتھ انیسویں صدی کے مغربی تصورات اس کی جگہ لے رہے تھے۔ انھیں اثرات کے ساتھ دبیر کا مابعد الطبیعیاتی رنگِ سخن، جسے وہ ''طرز جدید'' کہتے ہیں اور اس کے موجد ہونے پر فخر کرتے ہیں: ع..... ہر مرثیے میں موجدِ طرزِ جدید ہوں، بے وقت کی راگنی بن گیا۔ مرزا دبیر، ذوق کی طرح، پیچھے چلے گئے اور میر انیس، غالب کی طرح، آگے آ گئے۔

سلام و رباعی:

مرزا دبیر نے مجلسی ضرورت کے پیش نظر سلام بھی کہے اور رباعیاں بھی لکھیں۔ ان کے سلاموں پر مرثیے کا رنگ غالب ہے۔ وہ سلام میں، انیس کی طرح، اور دوسرے موضوعات کم کم لاتے ہیں۔ انیس کے ''سلام'' غزل کے مزاج سے قریب ہیں اور ان میں بہت سے ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جو ضرب المثل بن گئے ہیں اور جنھیں، مزاج کے اعتبار سے، غزل کے اشعار میں ملایا جا سکتا ہے۔ دبیر کے سلاموں میں عام طور پر یہ رنگ اس طور پر نہیں ملتا۔ وہ زیادہ تر ''سلام'' کو اپنے مذہبی تصورات کے اظہار کا ذریعہ بناتے ہیں اور مرثیہ پڑھنے سے پہلے، مجلس میں حزنیہ فضا پیدا کرنے کے لیے رباعیات و سلام پڑھتے ہیں۔ ع..... روئیں سب مجرئی پر درد کلام ایسا ہو۔ اس دور کے لکھنؤ میں غزل میں مبتذل اشعار اور کنگھی، چوٹی، انگیا سے وابستہ موضوعات عام طور پر بیان کیے جاتے تھے۔ ''سلام'' نے، جو ہیئت کے اعتبار سے ''غزل'' اور ''موضوع'' کے اعتبار سے مذہبی خیالات کا بیان ہے، ایک طرف غزل کے عام رواج اور اس کی مقبولیت سے مجلس کے مذہبی اجتماع میں فائدہ اُٹھایا اور دوسری طرف غزل کے مبتذل موضوعات کو نامقبول بنانے کا کام بھی کیا۔ ''سلام'' آج بھی مجلس کا حصہ ہے۔ ''دفتر ماتم'' کی جلد ۱۶، ۱۷، ۱۸ میں دبیر کے ''سلام'' ردیف وار دیوان کی شکل میں مرتب کیے گئے ہیں۔ جلد ۱۹ میں مخمس سلام ہیں۔ یہ سب ملا کر کوئی ۳۵۰ سلام ہوں گے۔

مرزا دبیر نے متعدد رباعیاں کہیں، جن میں سے بہت سی آج بھی صاحبانِ ذوق کی زبان پر چڑھی ہوئی ہیں۔ ''دفتر ماتم'' کی بیسویں جلد میں دبیر کے نوحے و قطعات کے علاوہ ردیف وار رباعیات یکجا و مرتب کی گئی ہیں۔ دبیر کی رباعیات پر بھی مذہبی و اخلاقی رنگ چھایا ہوا ہے جن میں پند و نصائح، عبرت و بے ثباتی، ناقدری اہل کمال، شاعرانہ تعلّی، انسانی قدروں، حیات و ممات اور عجز و انکسار کو موضوعِ رباعی بتایا ہے۔ بعض رباعیوں میں دبیر عام مشاہدات کا اس طرح نیا رُخ دکھاتے ہیں کہ رباعی دل میں اُتر کر زبان پر چڑھ جاتی ہے مثلاً

(۱) رحمت کا تری امیدوار آیا ہوں — منھ ڈھانپے کفن سے شرمسار آیا ہوں
چلنے نہ دیا بارِ گناہ نے پیدل — تابوت میں کاندھوں پہ سوار آیا ہوں

Scanned with CamScanner

(۲) گھر اپنا اجاڑ کر بسایا تجھ کو ڈھانپا جو کفن سے منھ دکھایا تجھ کو
اے قبر کہاں کہاں نہ کی تیری تلاش جب خاک میں مل گئے تو پایا تجھ کو

دبیر وانیس دونوں نے نہ صرف صنفِ رباعی کو اردو میں خوش اسلوبی سے آگے بڑھایا بلکہ اسے وہ مقبولیت ورواج دیا کہ آج بھی یہ ایک ایسی مقبول وپسندیدہ صنفِ سخن ہے کہ ہر شاعر عام طور پر رباعی ضرور کہتا ہے:

جو علم و معانی و بیاں کو سمجھے البتہ دبیر کی زباں کو سمجھے
کیا دادِ بلندیٔ سخن اس سے بھلا یکساں جو زمین وآسماں کو سمجھے

مرزا دبیر، جیسا کہ ہم لکھ آئے ہیں، بہت مصروف اور اسی لیے لاپروا شاعر تھے۔ ایک دفعہ کہہ کر شاید ہی اس پر نظرِ ثانی کرتے ہوں اور نئے مرثیے پر لگ جاتے تھے۔ اسی لیے ان کے ہاں میر انیس سے کہیں زیادہ فنی غلطیاں ہیں۔ عبدالغفور خاں نساخ نے ''انتخابِ نقص'' میں اُن کی بہت سی غلطیوں کی نشان دہی کی ہے مثلاً

(۱) ہم دیکھیں گے آج عالمِ ہستی کے طبق کو کرتے ہیں نبی آج وصی نائبِ حق کو [۳۶]

یہاں ''عالم'' کا عین گر رہا ہے۔ اسی طرح یہ شعر پڑھیے:

(۲) بابا کا لہو پہلے تو چہروں پہ لگایا پھر دونوں نے مابینِ گلیم ان کو لٹایا [۳۷]

''مابین'' کا استعمالِ لغت ومحاورہ کے خلاف ہے۔ اسی طرح ایک اور شعر دیکھیے:

(۳) شہ نے کہا کر دیوے گا اللہ سب آسان ہاں کاغذ و داوات وقلم لاؤ تو اس آن [۳۸]

''داوات'' کی دال کے بعد الف زاید وغلط ہے۔ مرزا دبیر کے کلام میں اس قسم کی غلطیاں دیکھ کر نساخ نے لکھا تھا کہ ''بعض اشعار کے وزن وقافیہ وردیف میں بھی فتور نظر آیا۔ معلوم ہوا کہ ماہرینِ فن، جو اُن کے کلام میں سلامتی سقم سے خاموش تھے، بے جانہ تھے...... اسی طرح جو لوگ کہ جناب مرزا دبیر کو جناب میر انیس پر ترجیح دیا کرتے تھے وہ امر بھی برخلاف معائنہ ہوا کہ مرزا صاحب کے کلام میں بہت زیادتی سے نقصان دیکھا اور میر صاحب (انیس) کے کلام میں اس سے بہت کم خلل پایا'' [۳۹]۔

شبلی نعمانی نے بھی مرزا دبیر کے کلام کا جائزہ لے کر، علم بیان کی رُو سے، ان کے کلام پر اعتراض کیے ہیں مثلاً ایک بات یہ کہی ہے کہ وہ اکثر ثقیل وغریب الفاظ استعمال کرتے ہیں مثلاً

ع...... مستدعیٔ شق القمر آکر ہوئے گم راہ

ع...... ہر کوہ کی آواز انا الطور انا الطور

ع...... رُخ ہینۂ صدق کرامات پیمبر

ع...... مجتمع جمیع فضائل ملک سیر

Scanned with CamScanner

یہ دراصل ناسخ کے زیر اثر، اس دور کا پسندیدہ رنگ تھا اور خود ناسخ کے کلام میں ثقیل و غریب الفاظ کی اسی لیے کثرت تھی۔ یہ ناسخ کے ''طرزِ جدید'' کا حصہ تھا۔ مرزا دبیر بھی اسی رنگِ سخن کے شاعر مرثیہ گو تھے۔

شبلی نے کلام میں ناموزونی کے بارے میں لکھا ہے کہ ''مرزا صاحب کے کلام میں اس قسم کی ناموزونی نہایت کثرت سے ہے مثلاً:

ع..... اک شخص کمر شہ کی لگا باندھنے خورسند

ع..... اک دَلو بھرو، پانی سے اور ایک رُطب لو

ع..... ملبوس قلم کار نہ دون ہے نہ پرانا

ع..... سر کو عوض پارہ مدحت میں دھروں گا / شرع کہن ناطقہ منسوخ کروں گا

ع..... یہ صورت پیغمبر قوسین مکان ہے

جہاں تک ایسے دوسرے الفاظ کا تعلق ہے، جو آج متروک ہو گئے ہیں، مرزا دبیر کے ہاں زیادہ نہیں ہیں مثلاً:

یاں : ے تم جاؤ میں یاں بہر شفا کھولتی ہوں بال

دیوے گا : ے شہ نے کہا کر دیوے گا اللہ سب آسان

بحیثیتِ مجموعی دبیر کی زبان آج کی معیاری و ٹکسالی زبان ہے جس کا استعمال زبان کے جدید روپ کے مطابق ہے۔

مسکی مرثیہ انیس و دبیر کے ہاں اپنے نقطۂ عروج اور درجۂ کمال کو پہنچ جاتا ہے اور یہ دونوں اس کے سارے امکانات کو اپنے تصرف میں لا کر دوسرے مرثیہ نگاروں کے لیے، سوائے اس روایتِ مرثیہ کی تکرار کے، کچھ نہیں چھوڑتے۔ اسی لیے میر انیس اور مرزا دبیر کو خواتمِ مرثیہ کہنا چاہیے۔

Scanned with CamScanner